Discussion Paper -I

پاکستان میں جمہوری وفاقیت کا بحران اور قومی خودمختاری

(سندھ کیس)

جامی چانڈیو

(سندھ کیس)

پاکستان میں جمہوری وفاقیت کا بحران

اور قومی خودمختاری

(۱۹۴۰ء کی قرارداد کی بنیاد پر وفاق کی ازسرِ نو تشکیل اور نئے سماجی معاہدے کی دستاویز)

جامی چانڈیو

سینٹر فار پیس اینڈ سول سوسائٹی

98 – B قاسم نگر، قاسم آباد، حیدرآباد

Ph: +92 22 2652401, +92 22 2904408, Fax: +92 22 2652401

www.cpcs.org.pk

E Mail: info@cpcs.org.pk, cpcs.sindh@hotmail.com

جملہ حقوق محفوظ

26

کتاب کا نام:	پاکستان میں جمہوری وفاقیت کا بحران اور قومی خود مختاری
موضوع:	سندھ کیس
تحریر:	جامی چانڈیو
کمپوزنگ:	سلیمان سمیجو
سال:	فروری 2010ء
ناشر:	سی پی سی ایس
قیمت:	پچاس روپے

کتاب ملنے کی جگہ

مسٹر بکس اسلام آباد، سعید بوک شاپ اسلام آباد، فیروز سنز-مال روڈ لاہور، تھامس اینڈ تھامس بُک ہاؤس، کراچی- کاٹھیاواڑ بُک ہاؤس کراچی- سندھیکا کتاب گھر، حیدرآباد- بھٹائی کتاب گھر، حیدرآباد- گلشن پبلیکیشن، حیدرآباد- فکشن ہاؤس، حیدرآباد-رابیل کتاب گھر، لاڑکانہ -گل کتاب گھر، شکارپور- جنید کتاب گھر، دادو-سندھیکا کتاب گھر، سکر، مارئی کتاب گھر، سکر- مہران کتاب گھر، میرپورخاص -ہلال کتاب گھر، میرپورخاص، سندھ بُک کلب، نوابشاہ.

All Rights Reserved

Book Title:	Crisis of Democratic Federalism and National Autonomy in Pakistan (Abridgement)
Subject:	Discussion Paper – I
Authored by:	Jami Chandio
Year:	February 2010
Published by:	Center for Peace & Civil Society B – 98, Qasim Nagar, Qasimabad, Hyderabad, Sindh, Pakistan.

انتساب

ملک کی مظلوم قومیتوں اور مظلوم طبقات کی
قومی، طبقاتی اور جمہوری جدوجہد کے نام،
جن کے ساتھ پاکستان، وفاق اور آزادی کے
نام پر تاریخی دھوکہ ہوا۔

"وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں"

– جامی چانڈیو

-

فہرست

پاکستان میں جمہوری وفاقیت کا بحران اور قومی خود مختاری 7

- برِصغیر کی تقسیم اور صوبائی خود مختاری 9
- مذہب کا ناجائز استعمال 11
- مسلم لیگ کی منافقت اور پاکستان کی بنیاد 12
- پاکستان کی تاریخ اور قومی/ صوبائی خود مختاری کا سوال 14
- پاکستان کے آئین اور قومی/ صوبائی خود مختاری 18
- جمہوری وفاقیت کا بحران اور قومی/ صوبائی خود مختاری کے مسائل 20
- قوموں کی آئینی خود مختاری 26
- معاشی خود مختاری 27
- قدرتی وسائل کا استحصال اور صوبائی خود مختاری 33
- وفاقی بیوروکریسی اور چھوٹے صوبوں کے مقامی لوگوں کی نمائندگی 38
- پانی کا تنازعہ اور قومی/ صوبائی خود مختاری 41
- ثقافتی خود مختاری 46
- جمہوری وفاقیت کے بحران کے نتائج 47
- مظلوم قوموں کے قومی مطالبات 48
- ببلیوگرافی 53

(جامی چانڈیو کی انگریزی زبان میں لکھی ہوئی تحقیقی
اور تجزیاتی کتاب

"Denial of Democratic Federalism and

National Autonomy in Pakistan"

کا اردو زبان میں اختصار)

پاکستان میں جمہوری وفاقیت کا بحران اور قومی خود مختاری

پاکستان کا ریاستی بحران اب کوئی پوشیدہ راز نہیں رہا۔ پاکستان کو دنیا میں عموماً ایک ناکام، متنازعہ اور پیچیدہ ریاست کے حوالے سے دیکھا اور جانا جاتا ہے۔ دنیا میں کوئی بھی ملک اور ادارہ اس پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ داخلی طور پر ملک میں صرف حکومت ہی نہیں بلکہ ریاست کا بھی کوئی مثبت، عوام دوست اور فعال وجود نظر نہیں آتا۔ پختونخواہ میں مذہبی دہشتگردی کی آگ بھڑک رہی ہے، جس سے ریاست کی دفاعی قوت اور عسکری صلاحیت بے نقاب ہو چکی ہے۔ کیونکہ چھ دہائیاں ملک کے تمام وسائل "دفاع" کے نام پر "خرچ" کرنے کے باوجود اپنے ہی پیدا کیئے ہوئے پانچ دس ہزار دہشتگردوں کا مقابلہ نہیں ہو پا رہا (یا ریاست اس کا حقیقی تصفیہ کرنا ہی نہیں چاہتی)۔ بلوچستان میں صورتحال یہ ہے کہ سرکاری اسکولوں میں قومی ترانہ نہیں گایا جاسکتا اور اب خود ریاستی ادارے بھی وہاں محفوظ نہیں ہیں۔ سندھ میں ایسا کوئی دن خالی نہیں ہے، جس میں سندھ کے کونے کونے میں احتجاج، بھوک ہڑتال، دھرنے، لانگ مارچ اور مظاہرے نہ ہوتے ہوں۔ ملک میں امن وامان کے بحران اور لاقانونیت کی بھی کوئی حد نہیں رہی۔ غربت اور بیروزگاری نے عوام سے جینے کا حق چھین لیا ہے۔ توانائی کے بحران اور بدانتظامی سے ملک کا کاروبار گھٹنے ٹیک چکا ہے۔ صوبوں اور اس میں بسنے والی قوموں کی خود مختاری، این ایف سی ایوارڈ، پانی کا تنازعہ، مظلوم قوموں کا اپنے قدرتی وسائل پر مکمل اختیار، حقیقی پارلیمانی

جمہوری اندازِ حکمرانی، پارلیامینٹ کی بالادستی اور قومی/ صوبائی خود مختاری کے معاملات وہیں کے وہیں اُلجھے ہوئے ہیں۔

یہ صورتحال جس سنگین ریاستی بحران کا ہمہ گیر عکس پیش کرتی ہے، اس کا تو کوئی منصفانہ اور متوازن حل نکلتا ہوا نظر نہیں آتا اور نہ ہی حکومتی و ریاستی سطح پر اس کے لئے مطلوبہ سنجیدگی نظر آتی ہے۔ اس لئے اب یہ تیزی کے ساتھ ملک میں اپنی جڑیں پکڑ رہا ہے کہ یہ ملک مافیائوں اور ناجائز مفادات کا مسکن اور ایک لاعلاج مریض بنتا جا رہا ہے، اور اب اس ملک سے کسی بہتر تبدیلی اور انصاف کی توقع کرنا محظ ایک خودفریبی ہوگی۔ نئی نسل تو ایک طرف لیکن جس نسل نے یہ ملک بنایا تھا، اب وہ بھی مکمل طور پر پاکستان کے بہتر، جمہوری، قومی برابری پر مبنی اور اس کے سیکیولر مستقبل سے مایوس نظر آتی ہے۔

اس کے باوجود ملک کے تمام روشن خیال اور دوراندیش لوگ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ اگر ان تمام مایوسیوں اور پیچیدگیوں کے باوجود ملک کے باقی رہنے اور چلنے کی کوئی صورت ممکن ہو سکتی ہے تو وہ نظام کی تبدیلی، حقیقی جمہوریت اور محظ برائے نام اور رسمی صوبائی خود مختاری نہیں بلکہ چاروں صوبوں میں بسنے والی تاریخی قوموں کی مکمل خود مختاری اور ان قوموں کے درمیان ایک نیا عمرانی اور سیاسی معاہدہ ہی ہو سکتا ہے، جس کی بنیاد* ۱۹۴۰ء کی قراردادِ لاہور پر مبنی ہو۔ ۱۹۴۰ء کی قراداد میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ:

> [1] "It is considered view of this session of the All-India Muslim League that no constitutional plan would be workable in this country or acceptable to the Muslims unless, it is designed on the following basic principles, viz, that geographically contiguous units are demarcated into regions which should be so constituted, with such territorial readjustments as may be necessary, that the areas in which Muslims are in majority as in North-western and eastern zones of India, should be so grouped to constitute 'Independent states' in which the constituent units shall be autonomous and sovereign."

---

* Dr. Riaz Ahmed, "All India Muslim League and the creation of Pakistan", (A Chronology), p. 95

[1] محمد ابراہیم جویو، "سندھ منھنجے خوابن جی"، 2008ء، سینٹر فار پیس اینڈ سول سوسائٹی حیدرآباد، صفحہ : 197.

"..... وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، جیسا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی حصوں میں ہے، یکجا ہو کر "آزاد ریاستیں" بن جائیں، جن کی ترکیبی اکائیاں بااختیار اور خود مختار ہوں۔"

حال ہی میں موجودہ حکومت کی جانب سے پ پ پ رہنما میاں رضا ربانی کی قیادت میں آئینی اصلاحات کے لئے ایک کمیٹی بھی بنائی گئی ہے، جو کہ کہا جارہا ہے کہ "جمہوریت کے چارٹر" کے مطابق ۱۹۷۳ء کے آئین میں اصلاحات تجویز کریگی۔ پہلی بات تو آج تک ایسی کمیٹیوں کا کوئی خاطر خواہ عملی نتیجہ نہیں نکلا اور دوسرا یہ کہ اس کمیٹی کا مینڈیٹ اتنا محدود ہے کہ اگر وہ کام کرنا بھی چاہے تو بھی موجودہ حالات میں اس ریاستی بحران کا کوئی مستقل یا پائدار حل نہیں نکال سکتی۔ ایک متروک اور ۱۹۷۳ء کے آئین میں جزوی ترامیم کا یہ پیکیج اس مرتے ہوئے سیاسی نظام کیلئے کسی وقتی "فرسٹ ایڈ" سے زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہوگا۔

اب آیئے پاکستان کے مجموعی ریاستی بحران کے تناظر میں قومی تضاد اور قومی/ صوبائی خود مختاری کے سوال پر ایک نظر ڈالیں۔

برِصغیر کی تقسیم اور صوبائی خود مختاری:

برِصغیر کی تقسیم کے حوالے سے ریاستی سطح پر بہت غلط مفروضات، جواز اور دلائل پیش کیئے جاتے ہیں، جن کا لبِ لباب یہ ہے کہ پاکستان محظ اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا تھا، جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ خود پاکستان کی تخلیق کی دعویدار جماعت مسلم لیگ جب ۱۹۰۶ء میں ڈھاکا میں معرضِ وجود میں آئی تھی تو وہ اپنی سوچ اور نظریات میں فرقہ پرست اور انگریز پرست تو یقیناً تھی لیکن علیحدگی پسند ہرگز نہ تھی۔ مسلم لیگ مشترکہ ہندستان میں محدود وفاق اور مسلمان اکثریتی علاقوں اور بعد میں صوبوں کے لئے زیادہ سے زیادہ صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کر رہی تھی۔ انگریزوں یا خود کانگریس کے ساتھ ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ کے جتنے بھی مذاکرات یا اجلاس ہوئے اور جن مطالبات یا تنازعات پر بات چیت ہوئی، ان میں اسلام کا کوئی بھی ذکر نہیں تھا۔ اصل مسئلہ / اسلام کا نہیں بلکہ مشترکہ ہندستان میں محدود اختیارات کے حامل ایک جمہوری وفاق اور مسلمان اکثریتی علاقوں/ صوبوں کی مکمل خود مختاری کا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات اسلام یا ہندومت پر نہیں بلکہ شمال-مشرق

اور شمال-مغرب مسلمان اکثریتی صوبوں/ علاقوں کی خود مختاری پر مبنی تھے۔ ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ پیکٹ میں بھی مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیاں مذہبی نہیں بلکہ سیاسی معاملات کا وقتی سمجھوتہ اور تصفیہ ہوا، جو کہ بدقسمتی سے دیرپا ثابت نہ ہو سکا۔ ۱۹۲۸ء میں مسلم لیگ نے جس بنیاد پر کانگریس کی مشہور زمانہ "نہرو رپورٹ" (جو کہ اصل میں کانگریس کا ہندوستان کے لیے ایک تجویز کردہ آئین اور پالیسی مسودہ تھا) کو رد کیا، اس کے بنیادی اسباب اور محرکات بھی صوبائی خود مختاری پر مبنی تھے۔ دوسرے معاملات تو ایک طرف، خود* ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء میں اِلہ آباد میں مسلم لیگ کے وقتی صدر (اردو اور فارسی کے عظیم شاعر) علامہ محمد اقبال نے پہلی مرتبہ جب آل انڈیا مسلم لیگ کے اکیسویں اجلاس میں سندھ، پنجاب، سرحد اور بلوچستان کے علاقوں کو ملا کر، ہندستان میں شمال-مغرب اور شمال-مشرق مسلم اکثریتی ریاست (جو چاہے برطانوی شہنشاہیت کے اندر ہو یا باہر) کی تشکیل کا تصور دیا تھا، تو وہ بھی اسلام کے نام پر نہیں تھا، یہاں تک کہ وہ مسلم لیگ میں بھی متنازعہ بنا تھا اور چھوٹے صوبوں اور قومیتوں کے لوگوں نے اس تصور کو اُس زمانے میں بھی گریٹر پنجاب کے تصور سے تعبیر کیا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں انگریز سرکار کی جانب سے بنائی ہوئی یک طرفہ اور متنازعہ "سائمن کمیشن" کی ناکامی اور ۱۹۲۸ء میں کانگریس کی "نہرو رپورٹ" کی متنازعہ حیثیت سامنے آنے کے بعد ۱۹۲۹ء میں برطانوی حکومت کی جانب سے کروائی گئی "راؤنڈ ٹیبل کانفرنس" کی ناکامی کا سبب بھی کوئی مذہبی مسئلہ نہ تھا بلکہ محدود مرکز اور صوبائی خود مختاری کے حوالے سے آئینی ضمانتوں کے فارمولا پر کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان عدم اتفاق تھا۔ ۱۹۳۵ء میں انگریزوں نے "گورنمینٹ آف انڈیا ایکٹ" دیا تو وہ بھی مسلمانوں نے دل سے قبول نہیں کیا، کیونکہ اس میں بھی ایک مضبوط اور اختیارات کی مرکزیت کے حامل وفاق کا تصور دیا گیا تھا، جب کہ اس میں صوبوں کو بہت محدود خود مختاری دی گئی تھی۔ یعنی ۱۹۳۵ء کے انڈین ایکٹ کی متضاد اور متنازعہ حیثیت کا بنیادی سبب بھی مذہبی نہیں بلکہ آئینی اور سیاسی تھا، جس میں مسلم لیگ کا بنیادی اعتراض محدود صوبائی خود مختاری کے حوالے سے تھا۔ جب کہ ۱۹۳۵ء کے انڈین ایکٹ میں مسلم لیگ کے جداگانہ طریقہ انتخاب (Seperate Electorates) کے فرقہ پرست

* Dr. Riaz Ahmed "All India Muslim League and the Creation of Pakistan. (A Chronology) p.38-39

مطالبے اور سندھ کے ساتھ کچھ صوبوں کے قیام کو تسلیم بھی کیا گیا تھا لیکن محدود صوبائی خودمختاری کی وجہ سے وہ مسلم لیگ کے لیے متنازعہ بنا۔ جب کہ کانگریس کا اعتراض یہ تھا کہ مسلم لیگ کے جداگانہ طریقہ انتخاب کے فرقہ پرست مطالبے کو آئینی طور پر کیوں تسلیم کیا گیا ہے۔

مذہب کا ناجائز استعمال:

حقیقت یہ ہے کہ جہاں ایک طرف انگریز اور کانگریس کی پالیسیاں اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کیلئے انتہائی متنازعہ تھیں، وہاں خود مسلمانوں میں بھی صوبائی خودمختاری کو چھوڑ کر باقی بہت سے معاملات پر ان کے درمیان کوئی باہمی اتفاق نہیں تھا اور نہ ہی کسی جداگانہ مسلمان ریاست کے قیام کا کوئی واضح مطالبہ یا اس کے لئے کوئی وسیع تر اتفاق موجود تھا۔ گرچہ ۱۹۳۸ء کے کراچی کے اجلاس میں مسلم لیگ پاکستان کیلئے واضح مطالبہ کر چکی تھی لیکن تاریخی حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۰ء میں جب مسلم لیگ نے لاہور کے اجلاس میں ایک تاریخی قرارداد کو پاس کیا، جس میں وفاقی اکائیوں کے لئے خود مختار اور آزاد مملکتوں کی حیثیت کی بات کی گئی تھی، تب ہی سندھ اور مسلمان اکثریتی علاقوں میں سے کچھ صوبوں نے آگے بڑھ کر پاکستان میں شمولیت کی حمایت کی۔ کیونکہ اس میں صرف صوبائی خودمختاری نہیں بلکہ وفاقی قومی وحدتوں کو واضح طور پر آزاد اور خود مختار مملکتوں سے تعبیر کیا گیا تھا۔ اوپر دیئے ہوئے دلائل کے حق میں اس کے علاوہ مزید اور کون سا دلیل ہو سکتا ہے کہ ۱۹۴۶ء میں جب "کیبنٹ مشن" پلان میں مکمل صوبائی خودمختاری کی بات کی گئی تو مسلم لیگ پاکستان کے مطالبہ سے دستبردار ہونے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ وہ الگ بات ہے کہ جواہر لال نہرو نے اپنی کوتاہ نظری کا مظاہرہ کرکے ایک پریس کانفرنس کرکے اس نازک صورتحال کی کایا پلٹ دی اور بلاآخر بدقسمتی سے برِصغیر کی تقسیم وقوع پذیر ہوئی۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ تقسیم سے پہلے بھی متحدہ ہندستان میں اصل اور بنیادی مسئلہ، بحران یا تضاد صرف مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھا۔ جس میں اختیارات کی مرکزیت کا حامل وفاق مذہبی اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کو قبول نہیں تھا۔ یعنی کانگریس "ایک قومی نظریئے" (One Nation Theory) کے جھوٹے مفروضے اور اختیارات کی مرکزیت کی حامل وفاقی سوچ اور پالیسی سے بالاتر ہو کر صوبوں کو خودمختاری کی ضمانت دیتی تو مسلم لیگ "دو قومی نظریئے" (Two Nation Theory) کا فتنہ پیدا کرکے، اپنی فرقہوارانہ سوچ اور نظریئے کے باوجود ہندستان کی تقسیم کے لئے مسلمانوں کی حمایت حاصل نہ کر سکتی اور ہندستان شاید یوں تقسیم نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ

تقسیم سے پہلے موجود تضاد بنیادی طور پر مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھا، جس کا اصل محرک خودمختاری کا سوال تھا، لیکن انگریزوں، کانگریس اور مسلم لیگ تینوں فریقوں نے اپنے اپنے گروہی اور ناجائز مفادات کے لیے مذہب کا ناجائز استعمال کیا۔ انگریزوں کی خواہش تھی کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں مذہبی اور پس و پیش سیاسی تضاد پروان چڑھے، تاکہ وہ مشترکہ نظریاتی، معاشرتی اور سیاسی کردار ادا نہ کر سکیں۔ ۱۹۰۵ء میں انگریزوں نے بنگال کو تقسیم کرکے اس کی بنیاد رکھی۔ کانگریس بظاہر تو سیکیولر ہونے کی دعویدار تھی لیکن وہ خاص طور پر گاندھی اور موتی لعل نہرو کے بعد عملی طور پر متعصب کردار کے ساتھ سامنے آئی اور ایک کثیر مذہبی سیکیولر پارٹی کی بجائے عملی طور پر ہندو بورجوا طبقے کی نمائندہ پارٹی میں تبدیل ہو گئی۔ مسلم لیگ کے جاگیردارانہ کردار اور اس کی فرقہ پرست سوچ اپنی جگہ پر لیکن کانگریس نے اس کے جائز سیاسی مطالبات کو بھی نظرانداز کرتے ہوئے ان کو مذہبی رنگ دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مثلاً کانگریس بمبئی پریزیڈنسی سے سندھ کی علیحدگی کی شدید مخالفت کر رہی تھی اور اس طرح ہندستان کو کثیر قومی اور کثیر ثقافتی ملک تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تھی اور آخر دم تک مرکزیت پسند اور مضبوط وفاق کی حمایت اور صوبائی خودمختاری کی مخالفت کرتی رہی۔ جس سے دوسری مذہبی اقلیتوں اور خاص طور پر مسلمان اکثریتی علاقوں کے عوام میں سیاسی طور پر عدم سلامتی کا احساس پیدا ہوا۔ یعنی کانگریس کے سیکیولرزم کا عملی مطلب رام راج کا احیاء اور قیام تھا۔ اسی طرح مسلم لیگ نے محدود مرکز اور زیادہ سے زیادہ صوبائی خودمختاری پر مبنی اپنے جائز نقطۂ نظر کو سیکیولر اور مہذب سیاسی انداز میں پیش کرنے کی بجائے "دو قومی نظریئے" جیسی فتنے باز اور فرقہ پرست صورت میں پیش کیا، جس نے مسلمانوں کے حکمران طبقات کو تو فائدہ پہنچایا لیکن عوام کو ایک ایسے فرقہ پرست تضاد کی دلدل میں دھکیل دیا، جہاں سے نکلنے کے لئے وہ آج تک ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔

مسلم لیگ کی منافقت اور پاکستان کی بنیاد:

تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ جس مسلم لیگ نے متحدہ ہندستان میں مضبوط مرکز کے خلاف مسلسل جدوجہد کی اور کانگریس کی "نہرو رپورٹ" یا ۱۹۳۵ء کے انڈین ایکٹ کو مضبوط مرکز کی بنیاد پر رد کیا، اس نے پاکستان کے قیام کے بعد ایک طرف تو صوبائی خودمختاری کے تصور کی ہی نفی کرنا شروع کی اور اختیارات کی مرکزیت کے حامل اور متنازعہ ۱۹۳۵ء کے انڈین ایکٹ کو پاکستان کے عبوری آئین کے طور پر قبول کیا۔ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ لاہور کے تحت وفاقِ پاکستان میں شامل

ہونے والی اکائیوں کو آزاد اور خود مختار ریاستوں کا درجہ دینے کی بات کی لیکن مسلم لیگ نے پاکستان بننے کے بعد اپنے وعدوں اور جدوجہد کے ساتھ بدترین انحرافی اور مثالی غداری کی۔ یعنی جس ایکٹ کے خلاف اس نے ہندستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا، بعد میں اسی ایکٹ کو ہی پاکستان کے عبوری آئین کا درجہ دیا اور ۱۹۴۰ء کی قراردادِ لاہور، جس کو بعد میں "قراردادِ پاکستان" کا نام دیا گیا، کو عملی طور پر تاریخ کے کباڑ خانے میں پھینک دیا۔ تاریخ کا المیہ یہ بھی ہے کہ ملک کے بانی محمد علی جناح جو کہ متحدہ ہندستان میں مذہبی اقلیتوں کے سیاسی حقوق اور صوبائی خود مختاری کے سب سے بڑے وکیل اور علمبردار تھے اور جنہوں نے ہمیشہ اختیارات کی مرکزیت کے حامل وفاق کو رد کیا، انہوں نے بھی ۱۹۴۷ء سے لیکر تادم مرگ پاکستان کی بنیاد ۱۹۴۰ء کی قرارداد کے تحت استوار کرنے کے لئے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ ملک کے گورنر جنرل کے طور پر ان کو اختیارات حاصل تھے کہ وہ ۱۹۳۵ء کے مرکزیت پسند اور سامراجی عبوری آئین کو ترامیم کے ساتھ تبدیل کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے ایسی کوئی بھی کوشش نہیں کی، بلکہ اس کے برعکس پورا سال پُرجوش تقاریر کرتے رہے کہ ملک کی قومی زبان صرف اردو ہوگی اور ملک میں صوبائیت کی کوئی بھی گنجائش نہیں ہوگی۔ یعنی پاکستان کی خالق تاریخی اقوام کو آزاد اور خود مختار ریاستوں کا درجہ دینے کا واعدہ کرنے والے جناح صاحب اب محظ صوبائی خود مختاری تو کُجا صوبائیت کو ہی عصبیت کہتے رہے۔ مثلاً ۱۵ جون ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ میونسپالٹی کی جانب سے دیئے گئے استقبالیہ میں انہوں نے واضح طور پر کہا کہ:

> "برطانوی کنٹرول سے محفوظ رہنے کیلئے صوبائی خود مختاری اور مقامی آزادی کے لئے سارے ستون بنائے گئے تھے، جن کو کچھ لوگ آج تک تھامے ہوئے ہیں۔ لیکن اب تو اپنی مرکزی حکومت ہے، اس لئے پرانے غلط اصطلاحوں پر سوچنا، کمزور سہاروں کے برابر ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ صوبائی عصبیت یا مقامی اور ذاتی مفاد کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنا خود کشی کے برابر ہے۔"[1]

جناح صاحب نے ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ میں واضح طور پر کہا کہ:

> "آپ کے لئے لازم ہے کہ آپ بنگالی، سندھی، پنجابی، بلوچی اور پٹھان وغیرہ کی باتیں مت کریں، آپ فقط ایک قوم ہیں اور ایک ہی مملکت سے وابسطہ ہیں۔ یہ مملکت نہ پنجابی کی ہے، نہ بنگالی کی ہے، نہ سندھی کی اور نہ بلوچی کی ہے۔" [2]

---

[1] Jinnah: Speeches & Statements 1947-48، آکسفورڈ - 2000ء، صفحہ : 226

[2] ایضاً، صفحہ : 117

اسی طرح ۱۵ جون ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ میں شہری سپاسنامے کے جواب میں انہوں نے کہا:

> "ہم نہ بلوچی ہیں، نہ پٹھان، نہ سندھی، نہ پنجابی اور نہ بنگالی رہے ہیں۔ ہمارے احساس و عوامل سب پاکستانی ہونے چاہیئیں۔" [3]

اس کے علاوہ گیارہ اگست ۱۹۴۷ء کی اپنی مشہورِ زمانہ تقریر[4] میں جہاں ایک طرف انہوں نے اپنے ہی فرقہ پرست دو قومی نظرئے کو رد کرتے ہوئے ایک مثبت بات کی، وہاں انہوں نے پاکستانی قومیت کے غلط اور مفروضات پر مبنی خود فریب تصور پر زور دیا، جو کہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کی روح کے برعکس تھا۔ اس لئے مسلم لیگ نے اصل غداری سر سید، اقبال اور جناح سے نہیں بلکہ اختیارات کی مرکزیت مخالف جدوجہد، ۱۹۴۰ء کی قرارداد اور پاکستان میں شامل ہونے والی قوموں کے مابین سیاسی اور عمرانی معاہدے اور خاص طور پر مظلوم اقوام سے کی، جس میں جناح صاحب کے "کھوٹے سِکوں" کے ساتھ خود ملک کے بانی محمد علی جناح کے کردار کو بھی ہرگز معاف نہیں کیا جاسکتا۔ کانگریس کی منافقانہ اور مرکزیت پسند کردار کی مزاحمت پر جہاں ان کے کردار کو سراہا جا سکتا ہے، وہاں "دو قومی نظریئے" کی تشکیل اور قیامِ پاکستان کے بعد صوبائی خود مختاری کو رد کرنے، "اردو" کو قومی زبان کے طور پر مسلط کرنے اور خود ساختہ مفروضاتی "ایک قومی نظرئے" پر زور دینے پر ان کو کسی بھی طرح معاف نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان پالیسیوں اور رویوں کے بدترین نتائج آج ہم قومی طور پر بھگت رہے ہیں۔ جناح صاحب کو یہ معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ ملک میں شامل تاریخی قوموں کے تشخص اور وجود سے انکار پر مبنی نام نہاد اور مفروضاتی پاکستانی قوم کے نام پر ان کے "کھوٹے سکے" اور ملک پر قابض پنجابی-اردو بولنے والے حکمران طبقات اور ان کی نمائندہ اسٹیبلشمینٹ اس ملک کی مظلوم قوموں اور عوام کے ساتھ آگے چل کر کیا حشر کرینگے؟ آج جو بھی ملک کا یہ ہمہ گیر ریاستی بحران ہے، اس کی ایک اہم بنیاد یہ بھی ہے۔

پاکستان کی تاریخ اور قومی / صوبائی خودمختاری کا سوال:

اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ پاکستان کبھی بھی عملی طور پر ایک جمہوری اور تمام قوموں/ صوبوں کا نمائندہ وفاق نہیں رہا اور صوبائی خود مختاری کا ملکی تاریخ میں عملی طور پر

---

[3] ایضاً، صفحہ : 226

[4] ایضاً، صفحہ : 25

وجود تو دور کی بات، تصور بھی موجود نہیں رہا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی پوری تاریخ اس ملک میں پنجابی-اردو بولنے والے حکمران طبقات، ان کی نمائندہ ملٹری-سول اسٹیبلشمینٹ اور ان کے مقامی گماشتے وڈیروں، سرداروں اور جاگیرداروں کی سیاسی اجارہ داری، معاشی لوٹ مار اور مظلوم اقوام/ طبقات سے بدترین دھوکہ ہے، جس کو ثابت کرنے کے لئے مندرجہ ذیل مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

(۱) ۱۹۴۷ء کا آزادی کا ایکٹ جو پی سی او (PCO) کے تحت عمل میں آیا، وہ ۱۹۳۵ء کے اس انڈین ایکٹ کی بنیاد پر قائم ہوا، جس کو اختیارات کی مرکزیت کی وجہ سے مسلم لیگ نے پہلے رد کیا تھا۔ "۱۹۴۷ء کے آزادی ایکٹ" کے تحت پاکستان کے گورنر جنرل (محمد علی جناح) کو یہ اختیارات حاصل تھے کہ وہ عبوری آئین کو ترامیم کے ذریعے تبدیل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس "پاکستانی قومیت" کے غلط، خودفریب اور ۱۹۴۰ء کی قرارداد کی انحرافی پر مبنی مفروضے پر زور دیا۔

(۲) ۷ مارچ ۱۹۴۹ء کو ملک کے پہلے وزیراعظم اور نسلی و لسانی تعصب کے علمبردار لیاقت علی خان، جنہوں نے سیکیولر پاکستان کی نفی کرکے "قراردادِ مقاصد" (Objective Resolution) کا خاکہ پیش کیا۔ جس کو بعد میں ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو ملک کی پہلی آئین ساز اسیمبلی سے منظور کروایا گیا۔ "قرارداد مقاصد" جس کو آج تک پاکستان کی نظریاتی بنیاد کہا جاتا ہے، نے اصل میں پاکستان کو عملاً ایک مُلّاشاہی (Theocratic) اور اجارہ دار (Autocratic) ریاست میں تبدیل کر دیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ قراردادِ مقاصد دراصل ایک طرف ۱۹۴۰ء کی قرارداد کی روح کے خلاف سنگین مجرمانہ عمل تھا، تو دوسری جانب وہ ایک ایسے پاکستان کی بنیاد اور نظریاتی خاکہ تھا، جس نے گذشتہ چھ دھائیوں سے ملک کی مظلوم اقوام اور عوام کا خون چوسا ہے۔

(۳) ۱۹۴۹ء میں ہی اردو زبان کو زبردستی ملک کی باقی اقوام کے اوپر نام نہاد "قومی زبان" کے طور پر تھوپا گیا۔ اردو جو کہ ہندوستان میں تو کچھ مسلمان علاقوں کی مقبول زبان تھی، لیکن وہ پاکستان کی کسی بھی قوم کی تاریخی زبان نہ تھی، ملک میں ایک بہت بڑے ثقافتی تضاد کا سبب بن گئی۔ بدقسمتی سے پاکستان کی مظلوم قوموں کے ثقافتی استحصال کی بنیاد بھی خود ملک کے بانی محمد علی جناح اور لیاقت علی خان نے رکھی۔ جب انہوں نے بار بار اردو زبان کو ملک کی واحد قومی زبان

کے طور پر مسلط کرنے پر زور دیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ کہ بنگال کی علیحدگی کی بنیاد اس دن سے ڈلی جب اردو کو ملک کی واحد قومی زبان کے طور پر مسلط کیا گیا۔ جب کہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں اردو کے ساتھ بنگالی زبان کو بھی قومی زبان کا درجہ دیا گیا تھا لیکن تب تک بنگال کے دل میں پاکستان کی بنیادیں ہِل چکی تھیں۔ بہرحال بنگال تو بالآخر ۱۹۷۱ء میں اپنی بیحد قربانیوں کے نتیجے میں آزاد ہوگیا لیکن موجودہ پاکستان میں اردو کی ثقافتی اجارہ داری ابھی تک برقرار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی اجارہ داری نے خود اردو زبان کو بھی سخت نقصان پہنچایا، کیونکہ بدقسمتی سے ایک خوبصورت زبان (اردو) پاکستان میں قوموں کے لئے متنازعہ بن گئی اور یہ تضاد آج تک جاری ہے۔ جب کہ اردو سمیت پاکستان کی تمام زبانوں کو قومی زبان کا درجہ دینے میں اردو سمیت تمام زبانوں کا مفاد پنہاں ہوتا۔

(۴) ۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو زبردستی ملاکر "ون یونٹ" بنایا گیا، جس کے واضح طور پر دو مقاصد اور مفادات تھے۔ مشرقی پاکستان چونکہ آبادی کے لحاظ سے مغربی پاکستان سے بڑا تھا، اس لیے "پنجابی-اردو مستقل مفاد" کی نمائندہ سول ملٹری اسٹیبلشمینٹ بنگال یعنی مشرقی پاکستان کے اکثریتی جمہوری حق کو صلب کرنا چاہتی تھی اور نام نہاد پیرٹی (Parity) کی بنیاد پر ون یونٹ کے قیام کا ایک بنیادی سبب یہ بھی تھا۔ دوسرا یہ کہ اس ٹولے نے سندھیوں، بلوچوں، سرائیکیوں اور پشتونوں کے تاریخی، معاشی اور سیاسی حقوق کو بھی مکمل طور پر پائمال کرنا چاہا۔ اسی تناظر میں ون یونٹ کا دوسرا بدنیت مقصد یہ بھی تھا۔ ون یونٹ کے ذریعے ایک طرف بنگال کی اکثریتی حیثیت کی نفی کرتے ہوئے ان کے حقِ حکمرانی کے جمہوری حق کی نفی کی گئی تو دوسری جانب اس سارے عرصے میں سندھیوں، بلوچوں، پشتونوں اور سرائیکیوں کے وسائل کو "مالِ غنیمت" سمجھ کر لوٹ مار کی گئی۔ ون یونٹ کے سب سے بدترین اثرات سندھ اور سندھیوں پر پڑے، جس میں ان کی زمینوں، شہروں، پانی، خزانے، وسائل، ڈیموگرافی کے توازن اور تاریخی حقوق پر وہ بدترین ڈاکے ڈالے گئے، جن کا ازالہ یا سدِباب اب شاید کبھی بھی ممکن نہ ہو سکے۔

(۵) پاکستان میں اب تک چار مارشلا لگ چکے ہیں۔ جن کا کُل حکومتی عرصہ ۳۳ برس ہے۔ یعنی ملک کی ۶۳ سالہ تاریخ میں سے ۳۳ سال ملک میں ننگی آمریت رہی ہے۔ جنرل ایوب خان کا آمریتی عرصہ ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے لیکر ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء (دس برس پانچ مہینے اور

تین دن) تک چلا، جنرل یحیٰ خان کاآمریتی عرصہ ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء سے لیکر ۱۹ دسمبر ۱۹۷۱ء تک چلا (۲ سال ۹ مہینے اور ۶ دن)، جنرل ضیاءُالحق کاآمریتی عرصہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ع سے لیکر ۱۶ اگست ۱۹۸۸ء تک رہا (۱۱ سال ایک مہینہ اور ۱۱ دن) اور جنرل پرویز مشرف کاآمریتی دوُر ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۸ء (۹ سال) تک چلا۔

یوں تو ملک میں آمریتی حکومتوں نے جمہوریت، جمہوری اداروں، قانون کی حکمرانی اور احترام، میڈیا کی آزادی، عوام کی سیاسی آزادی، سیاسی کلچر اور ریاست و عوام کے اعتماد کو مکمل طور پر تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، جس کے نتائج آج بھی ملک کی ہر سطح پر دیکھے جاسکتے ہیں، لیکن دوسری جانب حقیقت یہ ہے کہ ملک کے آمریتی ادوار میں سب سے زیادہ مظلوم قوموں خصوصاً سندھیوں، بلوچوں اور سرائیکیوں نے سیاسی اور معاشی تکالیف اُٹھائی ہیں۔ جیساکہ ملک کی ملٹری اور سول اسٹبلشمینٹ اور ریاست پر قابض طبقے کی اکثریت کا تعلق سینٹرل پنجاب سے ہے، اس لئے آمریتی ادوار میں بھی ایک طرف اسٹبلشمینٹ نے پنجاب کے حکمران طبقے اور ان کے ناجائز مفادات کے نتھی تولوں جیساکہ اردو بولنے والے حکمران طبقے اور ان کے مقامی گماشتہ وڈیروں، سرداروں اور جاگیرداروں کو نوازا تو دوسری جانب سویلین حکومتوں کی نسبت مظلوم قوموں اور خصوصاً سندھیوں، بلوچوں اور سرائیکیوں کا سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی لہو پیا ہے۔ پاکستان میں چھوٹے صوبوں اور ان میں بسنے والی قوموں کو تو یوں بھی کبھی حقیقی قومی/ صوبائی خودمختاری نصیب نہیں ہوئی لیکن آمریتی ادوار میں تو ان کا تصور بھی ممنوع رہا ہے۔ اس لئے پاکستان کے سارے آمریتی ادوار بدترین مرکزیت پسند حکومتی نظام رہے ہیں۔ اب تصور کیا جا سکتا ہے کہ ملک کی ۶۳ سالہ تاریخ میں جب ۳۳ سال ننگی آمریت رہی ہو تو اس میں صوبوں، ان میں بسنے والی مظلوم قوموں کی قومی/ صوبائی خودمختاری کا کیا حشر ہوا ہوگا؟ اس لئے ہی شاید ہمیشہ آمریتوں کو بالادست صوبے پنجاب میں نہیں بلکہ چھوٹے صوبوں خصوصاً سندھ ہی سے مضبوط مزاحمت کا سامنا رہا ہے۔ وہ الگ بات ہے کہ آمریتوں کے بعد بھی منتخب سیاسی حکومتوں میں چونکہ مظلوم قوموں اور چھوٹے صوبوں کو کچھ بھی نہیں ملا، اس لئے اب مظلوم قوموں کے عوام کی اکثریت سیاسی حکومتوں سے بھی آہستہ آہستہ لاتعلق ہوتی جارہی ہے۔ کیونکہ ملک میں آمریتیں ہوں یا بے اختیار سویلین حکومتیں، حکومتی ایوانوں میں پارٹیاں تبدیل ہوں یا چہرے لیکن ریاست کے بنیادی ڈھانچے، طاقت کے توازن، اختیارات کی ساخت، قانون کی حکمرانی اور ملکی

کاروبار میں "پنجابی- اردو مستقل مفاد" کی اجارہ داری میں کوئی بھی فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے دیکھا جاسکتا ہے کہ مشرف دوُر میں سندھ اور بلوچستان نے پانی، مالیاتی اور قدرتی وسائل کے لئے تو انتھک جدوجہد اور مزاحمت کی لیکن اس بار ان کی جدوجہد کے محرکات، موضوعات اور مفادات کچھ اور تھے۔

پاکستان کے آئین اور قومی / صوبائی خودمختاری:

پاکستان کی آئینی تاریخ خود اس ملک کے عوام اور مظلوم قوموں کے ساتھ ایک سنگین مذاق کے مترادف ہے۔ ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو جس دن ملک کی پہلی آئین ساز اسیمبلی سے "قراردادِ مقاصد" کو پاس کروایا گیا، اس دن چوبیس ممبران پر مشتمل ایک "بنیادی اُصولوں کی کمیٹی" کا قیام عمل میں لایا گیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ "قراردادِ مقاصد" کی بنیاد پر ملک کے آئین کے لئے سفارشات ترتیب دیگی۔ اس کمیٹی کی سنجیدگی کا عالم یہ تھا کہ اس نے چھ سال کے بعد جاکر ۱۹۵۴ء میں اپنی سفارشات پیش کیں۔ اس دوران میں قراردادِ مقاصد کے خالق اور ملک کے سیکیولر مستقبل کے سیاسی، نظریاتی قاتل وزیراعظم لیاقت علی خان ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو قتل ہوگئے اور ان کی جگہ خواجہ ناظم الدین نے دوسرے دن یعنی ۱۷ اکتوبر کو ملک کی وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان سنبھالا۔ ۱۹۵۴ء میں جب کمیٹی نے اپنی آئینی سفارشات ترتیب دیں تب تک خواجہ ناظم الدین بھی گھر جا چکے تھے اور محمد علی بوگرہ نے قلمدان سنبھال لیا تھا۔ لیکن جب تک ان سفارشات کا ڈرافٹ منظوری کے لئے اسیمبلی میں پیش ہوتا، اس سے پہلے ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو ملک کے گورنر جنرل غلام محمد نے اسیمبلی ہی کو ڈسمس کرکے پاکستان کی غیر جمہوری پارلیامانی تاریخ کی بنیادیں رکھ دیں۔ اسیمبلی کے صدر مولوی تمیزالدین نے اس فیصلے کو سندھ چیف کورٹ میں چیلینج کیا اور بالآخر وہ کیس جیتا لیکن حکومت نے پھر سے رد عمل میں وفاقی کورٹ سے رجوع کیا اور چیف جسٹس محمد منیر نے اپنا مشہور اور بدنام زمانہ فیصلہ سُنایا، جس کے نتیجے میں مولوی تمیزالدین نے تو کیس ہارا لیکن پاکستان کی تاریخ میں عدلیہ کے نئے اور مخصوص موقعہ پرست کردار کی بنیاد پڑی۔ جس میں بنیادی اہمیت قانون، آئین اور جمہوری اُصولوں کی بجائے "نظریۂِ ضرورت" کو تھی۔ "نظریۂِ ضرورت" کی غلام عدلیہ اس ملک میں جمہوریت، آئین، قانون، انصاف اور جمہوری وفاق یا صوبوں اور ان میں بسنے والی مظلوم قوموں کے حقوق کو کون سا تحفظ دے سکتی تھی، یہ حقیقت پاکستان میں ایک کھُلا راز ہے۔

۱۹۵۶ء میں پاکستان کو بالآخر اپنا پہلا آئین ملا، جس میں ایک طرف ملک کو آئینی طور پر "اسلامی جمہوریہ پاکستان" قرار دیا گیا تو دوسری جانب ملک میں سینیٹ کے بغیر (Unicameral) پارلیامانی جمہوری نظام کو متعارف کروایا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء کے اساتیر کی نسبت ۱۹۵۶ء کے آئین میں زیادہ صوبائی خودمختاری دی گئی تھی لیکن چونکہ مغربی پاکستان میں ون یونٹ تھا، لحاظہ وہ صوبائی خودمختاری بنگال، سندھ، بلوچستان اور پختونخواہ کے لئے نہیں بلکہ عملی طور پر پنجاب کے ہی کام آئی۔

یہ آئین ملک کی دوسری آئین ساز اسیمبلی کی طرف سے دیا گیا، جو کہ ۲۸ مئی ۱۹۵۵ء کو گورنر جنرل کے آرڈر نمبر ۱۲، ۱۹۵۵ء کے تحت وجود میں آئی تھی۔ اس اسیمبلی کو ون یونٹ کے نفاذ کا بھی "اعزاز" حاصل ہے۔ چودھری محمد علی اُس وقت ملک کے وزیرِاعظم تھے اور ۱۹۵۶ء کا آئین جس کا ڈرافٹ ۹ جنوری ۱۹۵۶ء کو پیش کیا گیا، وہ ۲۹ فروری ۱۹۵۶ء کو اسیمبلی سے پاس کروایا گیا، اور ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء سے وہ آئین نافذ کیا گیا۔ تاریخ کا یہ اتفاق اپنی جگہ موجود ہے کہ یہ وہ ہی تاریخ تھی جب لاہور کے منٹو پارک میں ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کی جانب سے تاریخی قرارداد پیش کی گئی تھی، جس کو پاکستان کی بنیاد بھی کہا جاتا ہے۔

۱۹۶۲ء میں ملک کو دوسرا آئین ملا، جو کہ آمریت کی بدترین اجارہ داری کا دَور تھا۔ ایوب خان جس نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ملک کے دوسرے صدر کے طور پر اقتدار سنبھالا، ۱۷ فروری ۱۹۶۰ء کو ایک کمیشن کا قیام عمل میں لائے، جس کا مقصد پھر ایک نئے آئین کے لئے سفارشات ترتیب دینا تھا۔ ہر آمر کی طرح ایوب خان کو بھی "جمہوریت" کی بڑی فکر تھی اور اس نے "بنیادی جمہوریت" کو "سپورٹ" کرنے کے لئے ایک نیا آئینی ڈھانچہ دینا چاہا۔ بالآخر اس کے بنائے ہوئے آئینی کمیشن نے ۲۹ اپریل ۱۹۶۱ء کو اپنی رپورٹ پیش کی، جس کی بنیاد پر ۱ مارچ ۱۹۶۲ء کو ملک کے پہلے آمر کی طرف سے پاکستان کو دوسرا آئین ملا۔ ۱۹۶۲ء کے آئین میں پاکستان کو صدارتی حکومتی نظام دیا گیا اور بجا طور پہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک آمر کی طرف سے ایک آمر کے لئے، ایک آمر کا دیا ہوا آئین تھا۔ اس لئے تصور کیا جاسکتا ہے کہ اس آئین نے ملک میں جمہوری وفاق، صوبوں اور ان میں بسنے والی قوموں کے تاریخی حقوق اور خودمختاری کی کتنی "خدمت" کی ہوگی!

پاکستان کی منتخب جمہوری پارلیامینٹ کی معرفت پہلا آئین ۱۹۷۳ء میں ملا، جس کا کریڈٹ شہید ذوالفقار علی بھٹو کو دیا جاتا ہے، جو کہ ایک حقیقت بھی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا

۱۹۷۳ء کا آئین واقعی بھی ملک میں تمام قوموں کے قومی، تاریخی اور جمہوری حقوق کا پاسدار، صوبوں کو خودمختاری کی ضمانت دینے والا ایک بااُصول جمہوری آئین تھا؟ جواب ہے بالکل نہیں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد باقی رہ جانے والی اسیمبلی کو کوئی بھی آئینی اور اخلاقی اختیار نہ تھا کہ وہ بغیر مینڈیٹ کے نیا آئین بنائے۔ کیونکہ یہ اختیار تو آئین ساز اسیمبلی کو ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے خود یہ آئین ہی غیر آئینی ہے۔ ۱۹۷۳ء کا آئین اپنے بنیادی مزاج میں قراردادِ مقاصد کی توثیق و تائید کرنے والا، قوموں کے وجود کا انکاری، خودفریب اور گمراہ کن پاکستانی قومیت کے تصور کا علمبردار ایک ایسا آئین تھا، جس میں پارلیامانی نظام کے ذریعے ایک بے اختیار سینیٹ کو تو پیدا کیا گیا، لیکن صوبوں اور ان میں بسنے والی تمام قوموں کے تاریخی، معاشی، ثقافتی اور سیاسی حقوق کا کوئی بھی لحاظ نہیں کیا گیا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۹۷۳ء کا آئین دراصل ۱۹۳۵ء کے سامراجی انڈین ایکٹ کا نئے حالات میں ایک تسلسل تھا، بلکہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں تو ۱۹۳۵ء کی نسبت صوبوں کو کم خودمختاری دی گئی تھی۔ المیہ کی بات یہ بھی ہے کہ پاکستان کی تاریخ کے سب سے بڑے سحرانگیز عوامی رہنما شہید ذوالفقار علی بھٹو بنیادی طور پر صوبوں اور ان میں بسنے والی تاریخی قوموں کی خودمختاری کے حامی نہیں بلکہ ایک سخت مرکزیت پسند سیاسی رہنما تھے۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کا چہرہ مسخ ہونے کا آغاز بھی خود شہید ذوالفقار علی بھٹو کے اپنے دَور سے ہوا اور بعد میں ضیاءُ الحق سے نواز شریف اور جنرل پرویز مشرف تک اس کا چہرہ مسخ کرنے میں کسی نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں مسلسل غیر جمہوری اور غیر آئینی ترامیم سے قطع نظر ویسے بھی ملک کے تبدیل شدہ حالات میں ۱۹۷۳ء کا آئین متروک ہو چکا ہے، جو کہ موجودہ ریاستی بحران کو حل کرنے میں کوئی بھی نتیجہ خیز کردار ادا نہیں کر سکتا۔

جمہوری وفاقیت کا بحران اور قومی / صوبائی خودمختاری کے مسائل:

جیساکہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ پاکستان کی پوری تاریخ میں کبھی بھی حقیقی جمہوری وفاق کا عملاً کوئی وجود نہیں رہا، جس کے نتیجے میں وفاق اور صوبوں اور بڑے بالادست صوبے پنجاب اور چھوٹے صوبوں میں آباد مظلوم اقوام کے مابین سنگین تضادات موجود رہے ہیں، جن کا تصفیہ کبھی بھی انصاف کی بنیاد پر نہیں کیا گیا۔ آج تک یہ بحران جوں کا توں موجود ہے۔ پاکستان میں وفاقیت کے بحران کے حوالے سے چند بنیادی اشوز یہ ہیں۔

(الف) وفاق میں پنجاب کی اجارہ داری اور بالادستی:

دنیا کے کثیر قومی یا کثیر ریاستی نظاموں میں وفاق دراصل قوموں یا ریاستوں کے درمیاں ایک مشترکہ مفاد کے حامل الحاق یا معاہدے کا نام ہوتا ہے لیکن پاکستان میں وفاق پر مکمل طور پر ایک بالادست صوبے/ قوم یعنی پنجاب کی عسکری، سیاسی اور معاشی اجارہ داری ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ بنگال کی جبراً علیحدگی کے بعد پاکستان میں پنجاب کو دیگر شعبوں کے علاوہ خود پارلیامانیٹ میں بھی مستقل عددی اکثریت حاصل ہے۔ سینیٹ کو ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت وجود میں تو لایا گیا لیکن اس بے اختیار سینیٹ کی عملی حیثیت ایک سیاسی کلب سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ ملک کے تینوں فوجی اداروں (بری، بحری اور ہوائی) کے اندر قطعی اکثریت سینٹرل پنجاب اور پنجابیوں کی ہے۔ پاکستان کی سول بیورو کریسی میں آج بھی قطعی اکثریت پنجابی اور اردو بولنے والوں کی ہے۔ ملک کے نام نہاد وفاقی اداروں اور کارپوریشنس میں سندھی، بلوچ اور سرائیکی آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ البتہ پشتونوں کی نمائندگی ایک حد تک ملک کی ملٹری اور سول بیورو کریسی میں شروع سے موجود رہی ہے۔ اداروں کے لحاظ سے جیسا کہ وفاق پر عملی طور پر قبضہ پنجابی اور اردو بولنے والے حکمران طبقات کا ہے، اس لئے مرکز میں خواہ کوئی بھی حکومت ہو لیکن وفاقی مرکز عملی طور پر ان ہی مراعت یافتہ اور بالادست طبقات کے ناجائز مفادات کی پاسداری اور حفاظت کرتا رہتا ہے۔ پنجاب کے کچھ شاؤنسٹ حلقوں اور دانشوروں کی جانب سے اکثر کہا جاتا ہے کہ ایوب خان اور یحیٰ خان پٹھان تھے اور مشرف بھی ایک غیر پنجابی یعنی اردو بولنے والا تھا اور ضیاءُالحق ایک کشمیری تھا، اس لئے ریاستی جبر کا قصور پنجاب کو کیوں دیا جاتا ہے؟ یا پھر یہ کہا جاتا ہے کہ سندھی پیپلز پارٹی کی صورت میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد مسلسل اقتدار میں رہے ہیں لیکن پھر بھی پنجاب کی اجارہ داری کے خلاف شکوہ کیا جاتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اصل سوال اقتدار کی مسند پر بیٹھنے والے افراد کی زبان، نسل، صوبے اور قومیت کا نہیں ہے، بلکہ ریاست کے ڈھانچے، اس میں طاقت کے توازن اور پاور اسٹرکچر کا ہے۔ اس ملک کے موجودہ ریاستی ڈھانچے اور نظام کے اندر جو بھی اقتدار میں آئے گا، وہ پنجاب کے حکمران طبقے کے ناجائز مفادات سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ پاکستان میں غیر جمہوری ادوار میں مسند پر بیٹھا ہوا ایوب خان ہو یا یحیٰ خان، ضیاءُالحق ہو یا پرویز مشرف، وہ صرف کوئی فرد نہیں بلکہ اس اسٹیبلشمینٹ کے نمائندے ہوتے ہیں، جو کہ پنجاب کے حکمران طبقے اور ان کے ذیلی حواریوں (خصوصاً اردو بولنے والے حکمران طبقے) کے ہی ناجائز اور مراعت یافتہ مفادات کا تحفظ کرنے والا ہوتا ہے۔

دوسری جانب منتخب حکومتوں میں بھی کوئی بھی سویلین حکمران ہو، وہ پنجاب کے ناجائز اور بالادست مفادات کو پورا کیے بغیر نہ تو اقتدار میں آ سکتے ہیں اور نہ حکومت کی مسند پر بیٹھ سکتے ہیں۔ نتیجے میں ملک کی مظلوم قوموں نے کبھی بھی پاکستان کے وفاق کو اپنا نمائندہ وفاق نہیں سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرقی پاکستان یعنی بنگال کی علیحدگی کے بعد موجودہ پاکستان وہ پاکستان ہے ہی نہیں جس کی حمایت میں ۳ مارچ ۱۹۴۳ء کو جناب جی۔ ایم۔ سید نے سندھ اسیمبلی سے قرارداد منظور کروائی تھی۔ عملی طور پر بنگال کی علیحدگی کے بعد یہ وہ ملک ہے جس کا خاکہ علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں الہٰ آباد میں مسلم لیگ کے اکیسویں اجلاس میں پیش کیا تھا اور جس کو اس بنیاد پر خود مسلمانوں نے رد کیا تھا کہ اس کا عملی طور پر مطلب "گریٹر پنجاب" ہوگا۔

(ب) ریاست کا ڈھانچہ اور طاقت کا توازن:

پاکستان کا ریاستی ڈھانچہ، اختیارات کی حدبندی اور اس میں طاقت کا توازن ہی ایسا ہے کہ جس میں ملک کی مظلوم قوموں کو موجودہ نام نہاد "وفاق اور جمہوری" ڈھانچے کے اندر قومی خودمختاری مل ہی نہیں سکتی، کیونکہ ایک طرف ریاست پر قابض اسٹیبلشمینٹ اور حکمران طبقے کا تعلق پنجابی -اردو مستقل مفاد سے ہے تو دوسری طرف ملک کی پارلیامینٹ میں بھی پنجاب کی قطعی عددی اکثریت ہے۔ سینیٹ میں گرچہ بظاہر صوبوں کی برابر نمائندگی ہے لیکن ایک تو یہ ایوان بے اختیار ہے دوسرا اس میں وفاق کے انتظام میں چلنے والے علاقوں جیسا کہ فاٹا وغیرہ کی نشستیں بھی عملی طور پر اسٹیبلشمینٹ کے ہاتھوں میں رہی ہیں اور تیسرا کہ سینیٹ میں صوبوں کی بظاہر Token نمائندگی تو نظر آتی ہے لیکن اس میں بسنے والی تاریخی قوموں جیسا کہ سندھیوں، پشتونوں، سرائیکیوں اور بلوچوں کی نمائندگی کبھی بھی پُراثر نہیں رہی۔ (مثلاً موجودہ وقت میں سینیٹ میں صوبہ سندھ کی ۲۲ نشستوں میں سے سندھیوں کی تعداد صرف سات ہے) سول بیورو کریسی کا تعلق بھی اسی حکمران ٹولے سے ہے۔ جب کہ ۱۹۴۰ء میں محض صوبائی خودمختاری کی بات نہیں کی گئی تھی بلکہ ریاستی و قومی خودمختاری کی بات پر اتفاق کیا گیا تھا اور دوسرے یہ کہ جب صوبے کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ صوبے محض انتظامی یونٹ نہیں بلکہ پاکستان کو تشکیل دینے والی تاریخی قوموں کے وطن ہیں، اس لئے اس کا مطلب صوبوں میں بسنے والی تاریخی قوموں کی قومی خودمختاری ہے لیکن جس ملک میں قوموں کے وجود، ان کی تاریخی حیثیت اور حقوق سے فقط زبانی ہی نہیں بلکہ آئینی طور پر بھی انکار کیا گیا ہو، وہاں کون سی حقیقی قومی حقوق کی پاسدار حقیقی صوبائی خودمختاری کی امید کی جا سکتی ہے؟ اس لیے ملک میں حقیقی جمہوریت اور ریاستی تضادات کا

حل تب ہی نکل سکتا ہے جب ریاست کی خالق قوموں کے درمیاں ایک نئے عمرانی اور سیاسی معاہدے کی تشکیل کی جائے۔

(ت) قومی حقِ حاکمیت اور سندھ :

آج کے جدید دوَر میں کوئی بھی قوم، قومی خود مختاری اور حقِ حاکمیت کے بغیر نہ توآگے بڑھ سکتی ہے اور نہ ہی آزاد حیثیت کے بغیر ترقی کر سکتی ہے۔ پاکستان دنیا کا وہ نام نہاد وفاقی ملک ہے، جہاں قوموں نے ملک میں شامل ہو کر، ایک لحاظ سے ایک نہ ختم ہونے والی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال دیا۔ قوموں کے تاریخی وجود کے انکاری اس ملک میں قومی خود مختاری و حقِ حاکمیت کا تو تصور ہی بغاوت سمجھا جاتا ہے۔ چھ دھائیاں گذرنے کے باوجود بھی قومیں ابھی تک اپنا قومی وجود اور تشخص منوانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں، جب کہ ان کی سیاسی، معاشی اور ثقافتی قومی خود مختاری کی بات تو ابھی بہت دور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی خود مختاری سے محرومی کے حوالے سے سندھ نے پاکستان کے اندر سب سے زیادہ تکالیف اُٹھائی ہیں۔

۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے سندھ کو فتح کرنے کے بعد اس کو جبراً بمبئ پریزیڈنسی میں شامل کر دیا۔ طویل اور مسلسل جدوجہد کے بعد سندھ نے بالآخر ۱۹۳۵ء کے انڈین ایکٹ کے تحت ۱۹۳۶ء میں اپنی صوبائی حیثیت حاصل کی۔ گرچہ ۱۹۳۵ء کے مرکزیت پسند انڈین ایکٹ کے تحت ہی سہی لیکن بہرحال سندھ کو ۳۷-۱۹۳۶ء سے ۴۷-۱۹۴۶ء تک محدود صوبائی خود مختاری کے دس برس ملے لیکن تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ اس ایک دھائی میں تین انتخابات اور پانچ وزارتِ اعلیٰ کے قلمدانوں کی تبدیلیوں اور بدترین داخلی سیاسی انتشار کی وجہ سے سندھ کو عملی طور پر ایک دن بھی خود مختاری سے فیضیاب ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔ یہ پوری دھائی سندھ میں اسیمبلی کے اندر باہمی دشمنی کی مانند سیاسی انتشار موجود رہا۔ وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں، منصب اور چہرے (غلام حسین ہدایت اللہ سے شہید اللہ بخش سومرو تک) تبدیل ہوتے رہے، لیکن عملی طور پر سندھ کو جزوی خود مختاری بھی نصیب نہیں ہوئی، جس میں ان کی حکومت آزادی، خود مختاری او ذمیداری کے ساتھ سندھ اور اس کے عوام کے لئے کوئی بنیادی اقدام لے سکتی۔ تاریخ کا عجب اتفاق یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں بھی سندھ میں حکمرانی کا وہ ہی فارمولا نافذ کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، جس میں اکثریتی اور وطن دوست سیاسی فریق کو دور رکھ کر انگریز، مسلم لیگ اور کانگریس کے مرہون منت سیاسی اقلیتی ممبران کو سندھ کے اقتدار کی باگ ڈور دی جاتی رہی۔ مثلاً افروری ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے جو نتائج سرکاری طور پر ظاہر کیئے گئے اُن میں جناب جی ایم سید

کی سربراہی میں سندھ یونائیٹڈ پارٹی کو ۲۲ نشستیں، سندھ ہندو سبھا (جس کا بعد میں اسیمبلی میں نام تبدیل کرکے "ہندو انڈپینڈنٹ پارٹی" رکھا گیا) کو ۱۱ نشستیں، انڈین نیشنل کانگریس کو ۸ نشستیں، آزاد ممبران (دو ہندو اور چھ مسلم) کو ۸ نشستیں، یورپی ممبران کو ۳ نشستیں اور مزدوروں کو ایک نشست ملی، لیکن سندھ میں انگریز گورنر سر لینسی لاٹ گراہم نے اکثریتی پارٹی کو چھوڑ کر انگریز سرکار کے منظورِ نظر سر غلام حسین ہدایت اللہ کو سندھ میں وزارت بنانے کی دعوت دی۔ جس کے پاس صرف چاس نشستیں تھیں۔* یہ تو محظ ایک مثال ہے۔ یہاں تک کہ ۴۷-۱۹۴۶ء تک سندھ میں حکومتوں کی یہ ہی صورتحال رہی اور حقیقی معنوں میں سندھ ان دس برسوں میں ایک دن بھی عملی طور پر قومی تو کُجا لیکن محظ جزوی صوبائی خود مختاری بھی حاصل نہ کر سکی۔

پاکستان کے قیام کے بعد تو کسی بھی حکومت یا دوَر کو ایسی حکومت یا دوَر نہیں کہا جا سکتا، جس میں سندھ کو قومی تو کیا محظ رسمی صوبائی خود مختاری بھی ملی ہو۔ آج سندھ میں انتظامی اہلیت، انفرااسٹرکچر، تعلیم، صحت، غربت اور حکومتی سطح پر جس اعتماد اور اہلیت کا بحران ہے، اس کا بنیادی سبب سندھ کا مسلسل قومی خود مختاری اور حقِ حاکمیت سے دور رہنا ہے۔ تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ انگریزوں سے پہلے میروں کے دوَر کو بھی حکمرانی کا ایسا دوَر نہیں کہا جا سکتا، جس میں سندھ کو حقیقی قومی خود مختاری حاصل رہی ہو۔ کیونکہ میر صاحبان کو قومی حکومت چلانے کا نہ تو تجربہ تھا اور نہ ہی ان میں ایسی انتظامی اہلیت اور سیاسی بصیرت تھی۔

موجودہ پاکستان میں قومی خود مختاری یا حقِ حاکمیت کے حوالے سے سندھی قوم سب سے زیادہ مظلوم ہے۔ کیونکہ ایک تو اسٹیبلشمینٹ اور پنجاب کا حکمران طبقہ کسی بھی صورت میں سندھ کو قومی خود مختاری دینے کے لئے تیار نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ کسی بھی صوبے میں ایسا نسل پرست، دہشتگرد اور فاشسٹ فتنہ نہیں پیدا کیا گیا ہے اور نہ موجود ہے، جیساکہ ضیاءُ الحق کے دوَر سے سندھ میں پیدا کیا گیا ہے۔ صرف گذشتہ ۲۰ برسوں کا حساب کتاب کیا جائے تو ہر دوَر میں سندھ میں عملی طور پر حقیقی اقتدار ایم کیو ایم کا رہا ہے اور مجال ہے کہ پ پ پ سے لیکر کوئی بھی اقتدار پرست ٹولہ ان سے موں موڑنے کی گستاخی اور جرئت بھی کر سکے۔ سید عبداللہ شاہ کے دوَر میں ایم کیو ایم کے خلاف جو عارضی اور وقتی آپریشن ہوا، اس کا سبب بھی کوئی سندھ کی خود مختاری اور بااختیار جمہوری حاکمیت نہیں بلکہ اسٹیبلشمینٹ کی طرف سے ان کو اطاعت کے لئے جزوی سبق

* محمد ابراہیم جویو، "سندھ منھنجے خوابن جی"، ۲۰۰۸ء، سینٹر فار پیس اینڈ سول سوسائٹی، حیدرآباد، صفحہ : ۹

سکھانا تھا۔ اب تو جیساکہ بغیر اعلان کے یہ طئے ہوگیا ہے کہ حکومت خواہ کسی کی بھی ہو، لیکن سندھ میں اصل راج ایم کیو ایم کا ہی ہوگا۔ اس لئے ایک بات واضح ہونی چاہیئے کہ صوبائی خودمختاری کا عملی طور پر کوئی بھی مطلب نہ ہوگا جب تک وہ خودمختاری اصل اور تاریخی قوموں کے حقِ حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتی اور اس کو عملی طور پر یقینی نہیں بناتی۔ یعنی دوسرے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ صوبے قوموں کے تاریخی وطن ہیں اور صوبائی خودمختاری اگر اپنے جوہر میں حقیقی قومی خودمختاری نہیں ہے اور اس میں خودمختاری اصل قوموں کی بجائے چند مراعت یافتہ گروہوں کو حاصل ہوگی تو پھر وہ ایک دھوکے کے سوا کچھ بھی نہ ہوگی۔ ویسے بھی صوبے تو انگریزوں نے بنائے، جو کہ بعد میں پاکستان نے برقرار رکھے۔ ۱۹۴۰ء میں تو آزاد اور خودمختار ریاستوں کی بات ہوئی تھی۔ سندھ کو جب انگریزوں نے فتح کیا تو ہم محض صوبے نہ تھے، بلکہ ایک آزاد قوم اور وطن تھے۔ اس لئے سندھ سندھیوں کا محظ صوبہ نہیں بلکہ تاریخی قومی وطن ہے اور سندھیوں کے لئے قومی خودمختاری کے بغیر ایسی صوبائی خودمختاری بے معنی ہے۔ جس میں ان کا حقِ حاکمیت عملی طور پر تسلیم نہ کیا جائے اور سندھ پر اندرونی طور پر بالادستی ایک نسل پرست اور دہشتگرد گروہ اور انکے مطیع اور بے ضمیر سندھی وڈیروں کی ہو۔

سندھ میں جام صادق کے دوَر سے لیکر اسٹیبلشمینٹ ایک فارمولا کو سامنے لائی کہ سندھ میں وزیراعلیٰ برائے نام کسی بھی ایک ووٹ رکھنے والے نام نہاد سندھی کو کیا جائے اور اصل اقتدار ایم کیو ایم کے حوالے کیا جائے۔ جام صادق، مظفر شاہ، لیاقت جتوئی، غوث علی شاہ، علی محمد مہر اور ارباب غلام رحیم کو اسی فارمولا کے تحت سامنے لایا گیا لیکن اب تو المیہ یہ ہے کہ ۱۹۸۸ء کی سید قائم علی شاہ کی حکومت کی طرح پ پ پ نے اس مرتبہ بھی عملی طور پر واضح کردیا ہے کہ چاہے ان کو واضح اور قطعی اکثریتی مینڈیٹ دیا بھی جائے لیکن ایم کیو ایم کو ہر حال میں سندھ کے اوپر مسلط کیا جائیگا۔ اس لیئے ایسی کوئی بھی خودمختاری سندھ کے لئے بے معنی اور توہین آمیز ہوگی، جس میں مادرِ وطنِ سندھ کی تاریخی طور پر مالک سندھی قوم حقِ حاکمیت سے محروم بنا کر دیوار سے لگائی جائے اور اصل حاکمیت اسٹیبلشمینٹ، ان کی ہمنوا ایم کیو ایم اور وطن فروش سندھی بولنے والے بے ضمیر وڈیروں کی ہو۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سندھ میں مستقل طور پر آباد دوسری زبانیں بولنے والی ثقافتی اور مذہبی اقلیتی آبادیوں کے ساتھ کوئی بھی امتیازی سلوک کیا جائے۔ شہری اور انسانی حقوق کے اعتبار سے سب برابر کے شریک ہیں لیکن سندھ پر سندھیوں کے تاریخی حق اور حقِ حاکمیت کا تسلیم کیا جانا بھی اولین شرط اور لازمی امر ہے۔

دوسری طرف ایک تو سندھی قوم پہلے ہی حقِ حاکمیت سے محروم رہی ہے اور دوسرے پرویز مشرف کے بدنیت نام نہاد لوکل حکومتی نظام نے بھی عملی طور پر سندھیوں کو جزوی خودمختاری سے بھی محروم کردیا ہے۔ نسل پرست اور آمر پرویز مشرف کے پیدا کیئے ہوئے اس بدنیت ضلعی حکومتی نظام کی وجہ سے ایک طرف سندھ کے شہروں کو مکمل طور پر نسلی دہشتگردوں کے رحم و کرم پر چھوڑا گیا اور ان کی انتظامی سیاسی بالادستی میں دیا گیا تو دوسری طرف سندھ کے تمام اضلاع کو مقامی طور پر اسلام آباد کے غلام وڈیروں کی سیاسی جاگیروں میں تبدیل کردیا گیا۔ اس لیئے جب تک اس بدنیت نظام کو ختم کرکے، حیدرآباد کو اصل شکل میں بحال کرکے، کراچی کو انتظامی سہولتکاری کے لئے پانچ یا چھ اضلاع میں تقسیم نہیں کیا جاتا، تب تک صوبائی خودمختاری کی بات بے معنی ہوگی، کیونکہ پھر تمام شہری مراکز تو مخصوص گروہوں کے ہاتھوں میں یرغمال رہتے ہیں اور مقامی آبادی کے حقِ حاکمیت کا جمہوری اور تاریخی حق اور استحقاق مجروح ہوتا ہے۔

قوموں کی آئینی خودمختاری:

خودمختاری محظ کوئی لفظ یا اصطلاح نہیں ہے بلکہ آج کے جدید دوَر میں ایک ایسا بنیادی اُصول اور افراد خواہ اقوام کا جمہوری حق ہے، جس کو جب تک آئینی تحفظ اور ضمانت حاصل نہ ہو، تب تک وہ بے معنی ہے۔ پاکستان کے مرکزیت پسند اور اجارہ داری پر مبنی ریاستی ڈھانچے اور نظام کے علمبردار اس کے تمام اساتیر (۱۹۷۳-۱۹۶۲، ۱۹۵۶-۱۹۴۷ء آزادی کا ایکٹ) ہیں، جو کہ برطانوی سامراج کی مرکزیت پسند اور خودمختاری مخالف سامراجیت کا تسلسل ہیں، جس کا مختصر ذکر ہم پہلے کرچکے ہیں۔

پاکستان میں صوبائی خودمختاری کا تب تک کوئی بھی مطلب، وزن یا اہمیت نہیں ہے، جب تک قوموں کے خودمختار تاریخی وجود کو تسلیم کرکے، اس کو مکمل طور پر آئین کا حصہ بنا کر، انہیں قومی خودمختاری کی آئینی ضمانت نہیں دی جاتی۔ اس لئے ہی ملک کے زیادہ ترسنجیدہ لوگوں کا مطالبہ رہا ہے کہ ۱۹۷۳ء کا مسخ شدہ اور بار بار مجروح کیا ہوا آئین جو کہ ویسے بھی اپنے آغاز سے ہی مرکزیت پسند تھا، اس میں جزوی ترامیم کے ذریعے ملک کی مظلوم قوموں کو، کوئی قومی خودمختاری ملنا ناممکن ہے، کیونکہ اس کی بنیاد ہی قوموں کے وجود سے انکار اور مرکزیت پسندی پر مبنی ہے۔ اس لیئے بہتر حل یہ ہوگا کہ ایک نئی آئین ساز اسیمبلی کا قیام عمل میں لایا جائے اور پھر اس اسیمبلی سے ایک آئین پاس کروایا جائے، جس کی بنیاد ۱۹۴۰ء کی قرارداد پر مبنی ہو، جو آئین قوموں کے درمیاں ایک نئے عمرانی اور سیاسی معاہدے کی حیثیت رکھتا ہو۔

معاشی خودمختاری:

قومی مالیاتی کمیشن اور مظلوم قوموں/ چھوٹے صوبوں کا معاشی استحصال:

دنیا میں جہاں کہیں بھی کثیر قومی یا کثیر ریاستی وفاقی نظام ہے، وہاں وفاق میں ایک ساتھ رہنے والی قوموں، ریاستوں یا صوبوں کے درمیاں مالیاتی وسائل کی تقسیم کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے، جس کو معاشی وفاقیت (Fiscal Federalism) یا معاشی عدم مرکزیت (Fiscal Decentralization) بھی کہا جاتا ہے۔ ایسی جمہوری وفاقی ریاستوں میں یہ استحقاق قوموں یا ریاستوں/ صوبوں کا ہوتا ہے کہ وہ مل کر طئے کریں کہ وفاق کو اپنا انتظام چلانے کے لئے کتنے وسائل دیئے جائیں؟ کیونکہ وفاق تو ایک معاہدہ اور انتظامی نظام کا نام ہے، جب کہ اس کی اکائیاں قوموں یا ریاستوں/ صوبوں پر مشتمل ہوتی ہیں، لیکن پاکستان دنیا کا واحد نام نہاد وفاق ہے، جہاں اُلٹی گنگا بہتی ہے۔ چھ دھائیاں گذر جانے کے باوجود پاکستان میں وفاقی ڈھانچہ برطانوی آبادیاتی (British Colonial) طرز کا ہے۔ جس کی بنیاد اختیارات کی مرکزیت اور مخصوص ناجائز مفادات پر مبنی ہے۔

قومی مالیاتی کمیشن ایوارڈ پاکستان میں شروع سے متضاد اور متنازعہ رہا ہے، کیونکہ یہ محظ پنجاب کے مفادات کے تحت بنتا رہا ہے۔ جب مشرقی پاکستان ہمارے ساتھ تھا اور وہ آبادی کے تناسب کے حساب سے پورے مغربی پاکستان سے بڑا تھا، تب این ایف سی ایوارڈ کی بنیاد آبادی پر نہیں بلکہ روینیو اور زمینی ایراضی (Inverse Pupulation Density) پر تھی۔ کیونکہ پنجاب صرف اس صورت میں ہی ملکی وسائل کا استحصال کر سکتا تھا، کیونکہ آبادی میں مشرقی پاکستان اکثریت میں تھا اور ایراضی اور آمدنی میں مغربی پاکستان کو سبقت حاصل تھی، لیکن مشرقی بنگال کی جبری علیحدگی کے بعد جب پنجاب آبادی کے لحاظ سے باقی تمام صوبوں کی نسبت اکثریت میں آگیا تو ۱۹۷۴ء کے این ایف سی ایوارڈ کے تحت، صوبوں میں مالیاتی تقسیم کی بنیاد پہلے کی طرح روینیو اور زمین کی بجائے صرف آبادی کو ٹھہرایا گیا، جو کہ ۳۵ سال قائم رہا۔ دنیا کی ۲۵ وفاقی ریاستوں میں ایسا کوئی بھی وفاقی ملک نہیں ہے، جس میں صوبوں/ ریاستوں کے درمیاں مالیاتی تقسیم صرف آبادی کی بنیاد پر ہوتی ہو۔ چھٹے مالیاتی ایوارڈ کے تحت سب سے پہلے 55 فصید حصہ سیدھا وفاق کو جاتا ہے، جس کو Vertical Distribution کہا جاتا ہے اور باقی بچے ہوئے 45 فیصد میں سے پنجاب کو 57.36 فیصد، سندھ کو 23.71 فیصد، بلوچستان کو 5.11 فیصد، جبکہ پختونخواہ کو 13.82 فیصد دیا جاتا ہے۔ جس کو تقسیمی پول (Divisible Pool) کہا جاتا ہے۔ دنیا میں کہیں بھی کسی وفاقی نظام کے تحت وسائل

کی ایسی ناجائز تقسیم کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ یعنی دونوں طرف سے اس فارمولا کے تحت ملک کے مالیاتی ایوارڈ کی صورت میں مالیاتی وسائل کا بڑا حصہ پنجاب لے جاتا ہے۔ جب کہ ملک کی مجموعی مالیاتی آمدنی میں سندھ تقریباً ۷۰ فصید دیتا ہے اور اگر این ایف سی ایوارڈ کا تعین روینیو کی پیداوار کی بنیاد پر کیا جائے تو پنجاب کا حصہ جاکے 23.06 فیصد ٹھریگا اور سندھ کا حصہ 69.02 فیصد ہوگا۔ نتیجے میں مالیاتی وسائل کی تقسیم پاکستان میں ہمیشہ مرکز، صوبوں اور پنجاب کے درمیان تنازعات کا سبب رہی ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت نے حال ہی میں (۱۰ دسمبر ۲۰۰۹ء) ملک کے ساتویں این ایف سی ایوارڈ کا اعلان کیا ہے۔ جس کے مطابق مرکز اور صوبوں کے درمیان وسائل کی تقسیم اب 56%-44% کی شرح کے تحت ہوگی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اب صوبے 45% کی بجائے 56% لینگے اور مرکز 55% کی بجائے 44% حصہ لے گا۔ جب کہ اُصولاً ہونا یہ چاہیئے تھا کہ یہ شرح 20%-80% رکھی جاتی۔ نئے ایوارڈ کے تحت صوبوں کے درمیان تقسیم اس مرتبہ صرف آبادی کی بجائے بظاہر کثیر معیار بنیاد پر کی گئی ہے، لیکن بدقسمتی سے اب بھی صوبوں کے درمیان وسائل کی تقسیم میں 82% حصہ آبادی کی بنیاد پر رکھا گیا ہے۔ جب کہ غربت اور پسماندگی کا حصہ صرف 10.3%، روینیو کی پیداوار اور کلیکشن صرف 5% اور ایراضی کی شرح کا حصہ 2.7% رکھا گیا ہے۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ملکی وسائل کا قطعی بڑا حصہ اب بھی بالادست اور بڑے صوبے پنجاب کو ہی جائے گا۔ (دیکھیں چارٹ نمبر ۲) مجموعی طور پر ساتویں این ایف سی ایوارڈ کے تحت اب پنجاب کو 53.1%، سندھ کو 24.94%، پختونخواہ کو 14.88% اور بلوچستان کو 7.17% حصہ ملے گا، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ملک کی مجموعی روینیو پیداوار میں 69.2% حصہ دینے والا صوبہ سندھ اس مرتبہ بھی محظ 24.94% حصہ لے سکے گا، جس سے سندھ کے احساسِ محرومی میں بدستور اضافہ تو ہو سکتا ہے، لیکن اُس کا سدِباب دور دور تک نظر نہیں آتا۔

اگرچہ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت ماضی کے مصلحت پسند اور بے انصافی پر مبنی مرکزیت پسند فیصلوں کی طرح اس ایوارڈ کو اپنا جمہوری کارنامہ قرار دیتی ہے، لیکن اُس کے برعکس تلخ حقیقت یہ ہے کہ سوائے بلوچستان کو جزوی فائدہ دینے کے باقی سندھ کو اس ایوارڈ سے نہ صرف کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا، بلکہ بنیادی طور پر ناجائز مفادات اور بے انصافیوں کا مالیاتی اسٹیٹسکو اس ایوارڈ میں بھی جوں کا توں برقرار رکھا گیا ہے۔

این ایف سی ایوارڈ کے حوالے سے مندرجہ ذیل باتوں پر عمل درآمد کے سوا صوبائی خودمختاری کے سوال کی اہمیت ایک دھوکے کے سوا کچھ بھی نہیں ہوگی۔

- سب سے پہلے وسائل اور آمدنی کی تقسیم کے اس ایوارڈ کو قومی مالیاتی ایوارڈ کی بجائے "وفاقی مالیاتی ایوارڈ" کہا جائے، کیونکہ پاکستان ایک قوم نہیں بلکہ بہت ساری اقوام کا الحاق/ وفاق ہے۔
- وفاق اور صوبوں کے درمیاں جو خزانے کی تقسیم ہوتی ہےاور جس کو Vertical Distribution کہاجاتاہے،اس کو ۱۹۹۷ء سے پہلے والے تناسب سے بحال کیاجائے، جس کے تحت مرکز کو20 فیصد اور صوبوں کو80 فیصد دیاجاتاتھا،جب کہ موجودہ وقت میں تقسیم کے تحت مرکز 55 فیصد لے جاتاہے،جب کہ صوبوں کو 45 فیصد حصہ دیاجاتاہے،اور نئے ایوارڈ کے تحت وفاق کو%44 اور صوبوں کو %56 دیا جائے گا۔ جو کہ چھوٹے صوبوں اور خصوصاً سندھ کے سراسر معاشی استحصال اوراقتصادی نسل کُشی کے مترادف ہے۔
- موجودہ آئین کے آرٹیکل 160 (ڈی) کے مطابق مرکز کو صوبوں کے درمیاں وسائل کی تقسیم میں کوئی بھی مداخلت نہیں کرنی۔ اس لئے صوبوں کے درمیاں تقسیم یعنی Horizental Distribution کو این ایف سی ایوارڈ میں شامل نہیں کیا جانا چاہیئے۔ یہ استحقاق صوبوں کا ہے کہ وہ یہ معاملات آپس میں جمہوری انداز میں طے کریں۔ جب کہ یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب مرکز میں صوبوں کے ٹیکسز اور آمدنی کے جدا جدا اکائونٹ رکھے جائیں، جس میں مرکز اپنے %20 حصے کی کٹوتی کے بعد صوبوں کے تمام مالیاتی وسائل اور آمدنی متعلقہ صوبوں کواپنے اپنے اکائونٹس کے ذریعے واپس کردے۔
- صوبوں کے درمیاں خزانے کی تقسیم اتفاق رائے سے نہیں بلکہ عالمی اُصولوں، انصاف پسند جمہوری روایات اور اکثریتی رائے کے تحت کی جائے۔ کیونکہ اتفاقِ رائے کا مطلب ویٹو پاور ہے، جو کہ عملی طور پر ایک بالادست صوبے/ قوم کی اجارہ داری کو فیصلہ کُن قوت بخشتا ہے، متضاد مفادات کی ایسی پیچیدہ صورتحال میں کوئی بھی فیصلہ اکثریتی رائے سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ جب پانی اور صوبائی خود مختاری کا تنازعہ اتفاق رائے سے حل نہیں کیا جاتا تو اتفاقِ رائے کا اطلاق صرف این ایف سی ایوارڈ پر ہی کیوں ہوتا ہے؟
- صوبوں کے درمیاں خزانے کی تقسیم آبادی کی بجائے کثیر المعیار فارمولے کے تحت کی جائے، جس میں بنیادی اہمیت آبادی کی بجائے روینیو اور غربت کو دی جائے۔ جب کہ اس نئے ایوارڈ میں بھی ۸۲ فیصد حصہ آبادی کی بنیاد پر رکھا گیا ہے۔
- جنرل سیلز ٹیکس کو مکمل طور پر صوبوں کے اختیار اور تحویل میں دیا جائے۔ آئین کے آرٹیکل 142 میں بھی یہ ہی کہا گیا ہے۔

- صوبوں کے کسی بھی ٹیکس کو وفاقی مالیاتی ایوارڈ کی TORs میں شامل نہ کیا جائے۔
- گئس ڈولپمینٹ سرچارج کا اُصولی طور پر مالیاتی ایوارڈ سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے اور نہ ہونا چاہیئے۔ صدر کو صرف وہ ٹیکس شامل کرنے کا اختیار ہے جو کہ مرکز اور صوبوں کے درمیاں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ جب کہ حقیقت میں جی ڈی ایس (GDS) ٹیکس نہیں بلکہ ایک قسم کی فی ہے۔ اس لئے یہ مکمل طور پر صوبائی معاملہ ہونا چاہیئے اور اس کو مالیاتی ایوارڈ میں شامل کرنے کی کوشش نہ صرف غیرآئینی ہے بلکہ صوبائی خود مختاری کی روح کے ہی خلاف ہے۔
- موجودہ وفاقی حکومت نے تیل پر ڈیوٹی کو بھی این ایف سی کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے، جب کہ آئین کے مطابق اس حوالے سے کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار صرف "کائونسل آف کامن انٹریسٹ" کو ہے، اس لئے وفاقی حکومت کو ایسا کوئی بھی اختیار نہیں ہے، یوں تیل پر ڈیوٹی کو این ایف سی ایوارڈ کا حصہ نہ بنایا جائے۔

پاکستان کی مجموعی آمدنی اور بجٹ ۱۴۰۰ ارب روپے ہے، جس میں سے حکومتی اعداد و شمار کے مطابق سندھ کا حصہ تقریباً ۹۰۰ ارب بنتا ہے، جب کہ موجودہ ایوارڈ کے تحت سندھ کو سالانہ ۱۲۵ ارب ملتے ہیں، جو کہ مرکز اور وفاق کے نام پر صریحاً معاشی لوٹ مار کے مترادف ہے۔ اُصولاً مرکز کو صوبوں کی طرف سے اس کے لیے طے شدہ حصے کے مطابق اپنا حصہ کاٹ کر باقی تمام ٹیکسز کی رقوم متعلقہ صوبوں کو واپس کی جانی چاہیئے۔

چارٹ 1:

مختلف این ایف سی ایوارڈز کے تحت وسائل کی بین الصوبائی تقسیم						
						(فیصد)
سال	**وفاقی/ صوبائی**	**پنجاب**	**سندھ**	**پختونخواہ**	**بلوچستان**	**کُل**
1974	20.80	60.25	22.50	13.39	3.86	100
1979	20.80	57.97	23.34	13.39	5.30	100
1985	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ
1990	20.80	57.87	23.29	13.54	5.30	100
1996	62.5:37.5	57.88	23.28	13.54	5.30	100
2000 (نہیں دیا گیا)	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ
2006 (تخمینہ)	45.55*	56.07	25.67	13.14	5.13	100

* صوبائی حصہ ۵۰ فیصد تک لانے کے لئے ہر سال ایک فیصد بڑھانے کا وعدہ کیا گیا

- PIDE working papers 2007: 33, Islamabad.

چارٹ 2:

ساتویں قومی مالیاتی ایوارڈ کے تحت وسائل کی تقسیم					
وفاق اور صوبوں کے درمیان تقسیم					
وفاق	2010-11ع	2010-15ء	صوبے	2010-11ء	2010-15ء
	57.50 فیصد	56 فیصد		42.50 فیصد	44 فیصد

صوبوں کے درمیان تقسیم		
صوبہ	ساتواں مالیاتی ایوارڈ	چھٹا مالیاتی ایوارڈ
پنجاب	51.74 فیصد	53.1 فیصد
سندھ	24.55 فیصد	24.94 فیصد
پختون خواہ	14.62 فیصد	14.88 فیصد
بلوچستان	9.09 فیصد	7.17 فیصد

کثیر معیار تقسیم کی شرح	
آبادی	82 فیصد
غربت/ پسماندگی	10.3 فیصد
آمدنی	5.0 فیصد
ایراضی	2.7 فیصد

چارٹ 3:

قومی مالیاتی ایوارڈ کے صوبوں کے درمیاں تقسیم کے موجودہ اور دیگر تجویز کردہ فارمولے				
صوبہ	**آبادی**	**غربت اور پسماندگی**	**روینیو کلیکشن**	**زمین/ جاگرافیائی چوڑائی**
پنجاب	57.36 فیصد	20.6 فیصد	23.04 فیصد	4.32 فیصد
سندھ	23.71 فیصد	22.5 فیصد	69.02 فیصد	7.18 فیصد
بلوچستان	5.11 فیصد	24.9 فیصد	2.40 فیصد	82.0 فیصد
پختونخواہ (سرحد)	13.82 فیصد	32.0 فیصد	5.54 فیصد	6.5 فیصد

Source: Jami Chandio, "Crisis of Federalism and Prospects for Provincial Autonomy in Pakistan", 2009, Chapter 3.

چارٹ 4:

وفاقی / صوبائی رونیو پروفائیل				
سال	وفاقی ٹیکس رونیو	صوبائی ٹیکس رونیو	وفاقی نان ٹیکس رونیو	صوبائی نان ٹیکس رونیو
1980	31503	1809	4731	559
1985	57921	3297	15184	1001
1990	114004	5431	38182	1188
1995	248059	9833	51395	8645
2000	386800	18800	90800	16100
2005	34611	34611	218271	22404
2006	42800	42800	247200	42800

Source: Economic Survey (various issues)

قدرتی وسائل کا استحصال اور قومی / صوبائی خودمختاری:

زیرِ زمین یا زیرِ آب قدرتی وسائل لاکھوں، کروڑوں سالوں کے مختلف اور پیچیدہ فطری مراحل سے گذرنے کے بعد وجود میں آتے ہیں، اور دنیا میں جہاں بھی وہ پائے جاتے ہیں، ان کو وہاں بسنے والی قوموں اور افراد کے لئے خوش بختی کی علامت سمجھا جاتا ہے، لیکن جدید نوآبادیاتی نظام میں یہ قدرتی وسائل اپنی مالک قوموں اور عوام کے لئے بد بختی، لوٹ مار اور معاشی نسل کشی کی علامت بن گئے ہیں۔ پاکستان میں چھوٹی قومیں اور خصوصاً سندھی اور بلوچ عوام پچھلی چھ دہائیوں سے اپنے قدرتی وسائل کی وجہ سے بدترین معاشی لوٹ مار کا شکار ہوئے ہیں اور یہ لوٹ مار گذشتہ چھ دھائیوں سے جاری ہے۔ جس میں دن بدن اضافہ تو ہو رہا ہے لیکن اس کے سدباب کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ مثلاً سندھ پاکستان کی مجموعی گئس کی پیداوار کا 71 فیصد پیدا کرتا ہے جبکہ بلوچستان کی ملکی گئس کی پیداوار میں حصیداری 22 فیصد ہے۔ تیل کی پیداوار میں بھی سندھ کی حصیداری 56 فیصد ہے، جبکہ پختونخواہ صوبہ 18 فیصد، پنجاب 25 فیصد اور بلوچستان ایک فیصد تیل پیدا کرتے ہیں۔ ملک میں کوئلے میں بھی سندھ کا حصہ تمام صوبوں سے زیادہ ہے، مثلاً گئس

کے ذخائر میں سندھ کا حصہ 58 فیصد ہے، تیل کے ذخائر میں 40 فیصد اور کوئلے کے ذخائر میں سندھ کا حصہ 88.7 فیصد ہے، جبکہ وفاق جو کہ دراصل پنجاب کے حکمران طبقے کے ناجائز سیاسی اور معاشی مفادات کا علمبردار اور محافظ ہے، وہ قدرتی وسائل کی رائلٹی کا 88.5 فیصد اوپر سے ہی لے جاتا ہے اور صوبوں کو صرف 12.5 فیصد حصہ ملتا ہے جو بھی افسر شاہی اور حکومتوں کی کرپشن کا نوالہ بن جاتا ہے اور اس میں سے تیل، گئس اور کوئلہ پیدا کرنے والے اضلاع اور صوبوں خصوصاً سندھ اور بلوچستان کے مظلوم عوام کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ اس کی ایک واضح مثال بدین ضلع ہے، جو کہ ملک میں تیل کی پیداوار میں سب سے آگے ہے، لیکن ترقی کے حوالے سے سب سے بدتر حالت میں ہے۔ یو این ڈی پی (UNDP) کی انسانی ترقی کے حوالے سے ۲۰۰۳ء کی رپورٹ میں پاکستان کے 91 (پاکستان میں 109 اضلاع ہیں) اضلاع میں سے بدین کا 60 وان نمبر ہے۔ قدرتی وسائل کے شعبوں میں کام کرنے والی کمپنیوں میں بھی سندھیوں اور بلوچوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ یعنی جو صوبہ روزانہ 67140 بیرل تیل اور 9.99 ارب کیوبک فٹ گئس پیدا کرتا ہے اور جس کا ملک کی رونیو کی پیداوار میں حصہ 70 فیصد ہے، اس کی معاشی حالت یہ ہے کہ اس کی 37 فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرتی ہے۔ اس کے ۷۰ فیصد گاؤں کے لوگ بے زمین کسان ہیں۔

کم و بیش وہ ہی حالت بلوچستان، پنجاب کے سرائیکی خطے اور پختونخواہ کے اکثریتی علائقوں کی ہے۔ جہاں بیشمار قدرتی وسائل ہونے کے باوجود اصل باشندے خستہ حال، دربدر اور زندگی کی بنیادی سہولیات و ذرائع سے محروم ہیں، اس صورتحال میں تب تک تبدیلی ممکن نہیں ہے، جب تک قدرتی وسائل پر مکمل اختیار صوبوں اور ان کے تاریخی طور پر مقامی لوگوں کو نہیں دیا جاتا۔

چارٹ 5:

ملک میں قدرتی وسائل کی تقسیم اور رائلٹی کا چارٹ		
صوبہ	گیس پیداوار (فیصد)	تیل کی پیداوار (فیصد)
سندھ	71	56
پنجاب	5	25
پختونخواہ	2	18
بلوچستان	22	0.1

- رائلٹی میں وفاق اور صوبوں کا حصہ:

  وفاق: 88.5 فیصد

  صوبے: 12.5 فیصد

Source: Pakistan Energy Year book 2008, Ministry of Petroleum and Natural Resources, Government of Pakistan.

چارٹ 6:

سندھ کے تیل اور گیس کے وسائل			
	گیس (ملین CFT)	تیل (ملین بیرل)	کوئلہ (ملین ٹن)
ملکی پیداوار	1,400,026	23.93	4.87
سندھ کی پیداوار	982،035	13.30	2.01
سندھ کا حصہ (فیصد)	70	56	41

Source: Pakistan Energy Year Book 2006

چارٹ 7:

قدرتی وسائل کے موجودہ ذخائر (۳۰ جون ۲۰۰۶ء تک)			
	گیس (ملین CFT)	تیل (ملین بیرل)	کوئلہ (ملین ٹن)
ملکی پیداوار	33.11	324.473	185,173
سندھ کی پیداوار	19.33	127.36	184,623
سندھ کا حصہ (فیصد)	58	40	99.7

Source: Pakistan Energy Year Book _ 2006

چارٹ 8:

پاکستان میں صوبوں کی تیل پیداوار کا چارٹ ۰۷-۲۰۰۶ء		
صوبہ	تیل پیداوار (ملین بیرل)	فیصد
سندھ	13.87	56.36
پنجاب	7.85	31.91
سرحد	2.8	11.619
بلوچستان	0.024	0.1
پاکستان	24.61	100 فیصد

Source: Pakistan Energy Year Book 2007, Ministry of Petroleum and Natural Resources GOP

چارٹ 8:

صوبوں کی سالانہ گیس پیداوار کا چارٹ ۲۰۰۶-۷ء				
صوبہ	نان ایسوسیئیٹڈ گیس (MMCF)	ایسوسیئیٹڈ گیس (MMCF)	کُل (MMCF)	فیصد
سندھ	979,198	21,217	1,000,415	70.77
پنجاب	52,481	16,127	68,608	4.58
سرحد	22,818	3,552	26,370	1.86
بلوچستان	318,188	0	318,188	22.50
پاکستان	1372,685	40,896	1413,581	100 فیصد

Source: Pakistan Energy Year Book 2007

چارٹ 9:

صوبوں کی سالانہ گیس پیداوار اور استعمال ۲۰۰۶-۰۷ء			
صوبہ	کُل گیس پیداوار (MMCF)	زیرِ استعمال گیس (MMCF)	ریشو (استعمال بمقابلہ پیداوار فیصد)
سندھ	1,000,415	459,369	15.91
پنجاب	68,608	638,008	930
سرحد	26,370	42,480	161
بلوچستان	318,188	82,138	25.81

Source: Pakistan Energy Year Book 2007

وفاقی بیورو کریسی اور چھوٹے صوبوں کے مقامی لوگوں کی نمائندگی:

جس طرح پاکستان میں کبھی بھی آمریتی یا منتخب حکومتوں میں تمام صوبوں اور ان میں بسنے والی تاریخی قوموں کا نمائندہ وفاق موجود نہیں رہا۔ اسی طرح پاکستان کے کسی بھی ادارے کو صحیح معنوں میں وفاقی ادارہ نہیں کہا جا سکتا۔ بیورو کریسی کسی بھی ملک میں اس ملک کے ریاستی ڈھانچے، پاور اسٹرکچر، طاقت کے توازن اور مجموعی حساب سے ریاست پر قابض قوتوں کے مفادات کی آئین دار ہوتی ہے، اس لئے ہی بیورو کریسی کو پوری دنیا میں ریاست کا انتظامی ہتھیار بھی کہا جاتا ہے۔ پاکستان کی بیورو کریسی بھی جیسا کہ مجموعی طور پر اسٹیبلشمینٹ کا حصہ ہے، اس لئے وہاں بھی پاکستان کے قیام سے پنجابی- اردو حکمران ٹولہ حاوی ہے، جس کی ویسے بھی ملک کی ملٹری اور سول اسٹیبلشمینٹ میں اجارہ داری رہی ہے۔ پاکستان میں ملٹری اور سول بیورو کریسی میں پنجاب اور پنجابیوں کی اکثریت رہی ہے، جس میں دوسرے نمبر پر اردو بولنے والے ان کے حصیدار رہے ہیں۔ باقی سندھیوں، سرائیکیوں اور بلوچوں کا مجموعی طور پر ملک کی بیورو کریسی میں تو کوئی خاطر خواہ حصہ یا نمائندگی نہیں ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم پنجابی یا اردو بولنے والے بھائیوں کے جائز حقوق یا ان کی مجموعی ترقی کے خلاف ہیں، لیکن سوال تمام شہریوں اور قوموں کے ساتھ انصاف اور جائز نمائندگی کا ہے۔ (ملاحظہ کیجئے چارٹ نمبر ۱۰)

ملک کے وفاقی ادارے ملک پر قابض پنجابی اور اردو بولنے والے حکمران طبقات کے ناجائز مفادات کے آئین دار رہے ہیں۔ مثلاً ملک کی بری، بحری اور فضائی فوج کے ادارے، ملک کے چاروں صوبوں اور ان میں بسنے والی تاریخی قوموں کے نمائندہ نہیں ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان کی فوج میں پنجاب (پنجابی بولنے والوں) کا حصہ 79 فیصد ہے، گرچہ مشرقی پاکستان یعنی بنگال ملک کی مجموعی آبادی کا 56 فیصد تھا، لیکن اس کے باوجود نہ صرف ان کی زبان اور قومی تشخص کو نظر انداز کیا گیا بلکہ ان کو فوج کے ساتھ تمام وفاقی اداروں میں نمائندگی برائے نام بھی نہیں دی گئی۔ یہ سراسر غلط ہے کہ مشرقی بنگال خود ملک سے الگ ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو عملی طور پر دھکیل کر ملک سے الگ کیا گیا تھا۔ کیونکہ اکثریتی آبادی کی وجہ سے مشرقی پاکستان یعنی بنگال پنجابی- اردو بولنے والے حکمران طبقات کے لئے ایک مستقل خطرہ تھا۔ (دیکھیں چارٹ نمبر 11-12)

*ملک کی وفاقی بیورو کریسی میں قوموں کی نمائندگی پر نظر ڈالیں تو تعجب اور افسوس ہوتا ہے، یعنی ۱۹۷۳ء تک ملک کی وفاقی بیورو کریسی میں پنجابی 49.3 فیصد تھے، پشتون 10.5 فیصد، سندھی صرف 3.1 فیصد، اردو بولنے والے 30.1 فیصد، فاٹا 2.6 فیصد اور آزاد جمون کشمیر 1.8 فیصد تھے۔ جب کہ بھٹو صاحب کے دوُر سے لیکر ۱۹۸۳ء تک کا تناسب اس طرح سے تھا۔ پنجابی 54.9 فیصد، پشتون 13.4 فیصد، سندھی 5.4 فیصد، اردو بولنے والے 17.4 فیصد، فاٹا 3.6 فیصد اور آزاد جموں کشمیر 1.9 فیصد۔ اس طرح ۱۹۸۶ء تک کا تناسب کچھ اس طرح سے تھا۔ پنجاب 55.3 فیصد، پشتون 12.6 فیصد، سندھ 7.2 فیصد، اردو بولنے والے 18.2 فیصد، فاٹا 1.4 فیصد اور آزاد جمون کشمیر 1.7 فیصد تھے۔ ۱۹۸۶ء کے بعد بھی اس صورتحال میں بہتری آنے کی بجائے صورتحال بتدریج خراب ہوتی چلی گئی۔ خصوصاً پرویز مشرف کے ۹ سالوں میں سندھیوں اور بلوچوں کو بالکل دیوار سے لگا دیا گیا۔ صوبائی بیورو کریسی میں بھی صورتحال کچھ زیادہ مختلف نہیں رہی۔ مثلاً صرف یہ دیکھا جائے کہ صوبہ سندھ میں گذشتہ چھ دھائیوں سے سندھ کا چیف سیکریٹری اور آئی جی پولیس کتنی مرتبہ کوئی سندھی رہا ہے؟ اگر پاکستان میں سیاہ و سفید کی مالک ملٹری اور سول بیورو کریسی رہتی ہے اور صوبوں میں تاریخی مقیمنوں اور دھرتی کے مالکوں کی جگہ بیوروکریسی اور انتظامی مشینری پر غیر مقامی لوگ قابض ہونگے تو صوبائی خودمختاری مظلوم قوموں کے ساتھ ایک مزید دھوکے کے علاوہ کوئی معنے نہیں رکھتی۔

صوبوں میں بسنے والی دوسری ثقافتی اور لسانی اقلیتوں کے جائز سیاسی، معاشی، ثقافتی اور لسانی حقوق کی پاسداری بھی اشد ضروری ہے، لیکن ان کی اجارہ داری یا مراعتیافتہ حیثیت سے مزید تضاد تو بڑھ سکتے ہیں، لیکن باہمی محبت کی فضا پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہم یہ بالکل نہیں کہتے یا سمجھتے کہ سندھ میں اردو بولنے والے بھائیوں کو آبادی کے اعتبار سے جائز حق نہیں ملنا چاہیئے، لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ سندھیوں کو زندگی کے ہر میدان میں دیوار سے لگایا جائے اور سندھیوں کو سندھ پر ان کے تاریخی حقِ حکمرانی سے عملاً محروم کر دیا جائے۔

* Jami Chandio, “Crisis of Federalism and Prospects for Provincial Autonomy in Pakistan” 2009, p. 186.

چارٹ 10:

وفاقی افسرشاہی میں قوموں اور نسلی گروہوں کی نمائندگی کا تناسب			
	1973	1983	1986
پنجابی	49.3 فیصد	54.9 فیصد	55.3 فیصد
پشتون	10.5 فیصد	13.14 فیصد	12.6 فیصد
سندھی	3.1 فیصد	5.4 فیصد	7.2 فیصد
اردو بولنے والے	30.1 فیصد	17.4 فیصد	18.2 فیصد
فاٹا	2.6 فیصد	3.6 فیصد	1.4 فیصد
آزاد کشمیر	1.8 فیصد	1.9 فیصد	1.7 فیصد

Source: Charles H. Kennedy, "Managing Ethnic Conflict: The Case of Pakistan", Regional Politics and Policy (Spring 1993): p. 138.

چارٹ 11:

پاکستانی فوجی افسرشاہی –1955 (پہلی دہائی)		
	مشرقی پاکستان / مشرقی بنگال	مغربی پاکستان
لیفٹیننٹ جنرل	0	3
میجر جنرل	0	20
برگیڈیئر	1	34
کرنل	1	49
لیفٹیننٹ کرنل	2	198
میجر	10	590
نیوی آفیسر	7	593
ایئر فورس آفیسر	40	640

Source: Dawn, 9 January 1956, Cited in Mizanar Rehman, 'The Emergence of Bangladesh as a Sovereign State,' Ph.D thesis, Institute of Commonwealth Studies, 1975, p. 67.

چارٹ 12:

مرکزی سیکریٹریٹ میں اعلیٰ افسر شاہی، 1955 (پہلی دہائی)		
	مشرقی پاکستان / مشرقی بنگال	مغربی پاکستان
سیکریٹری	0	19
جوائنٹ سیکریٹری	3	38
ڈپٹی سیکریٹری	10	123
انڈر سیکریٹری	38	510

Source: Pakistan Constituent Assembly Debates, vol. 1, 7 January 1956, Cited in Minazar Rehman, 'The Emergence of Bangladesh as a Sovereign State,' p. 68.

پانی کا تنازعہ اور قومی / صوبائی خودمختاری:

پانی کی تقسیم اس ملک کے اندر صوبوں خصوصاً سندھ اور پنجاب کے مابین ایک بڑے اور لامتناہی تنازعہ کا محرک اور سبب بن چکی ہے۔ جس نے وفاق کے باقی بچے ہوئے کمزور وجود اور لرزاں جواز کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے۔ حقیقت میں سندھ اور پنجاب کا پانی کی تقسیم پر تنازعہ آج کا نہیں ہے۔ یہ برِ صغیر میں انگریز حکومت یعنی ۱۸۵۹ء سے چلتا آ رہا ہے اور اس کا آغاز تب ہوا، جب مشترکہ پنجاب نے ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے دوران دریائے سندھ پر ناجائز طور پر ڈیم اور آبپاشی کے متنازعہ منصوبے تعمیر کرنا شروع کیے۔ یوں بھی پانی کی تقسیم پوری دنیا میں ایک بڑا حساس معاملہ رہا ہے۔ اس لئے اس کے قوانین بھی عالمی سطح پر بڑے سخت ہوتے ہیں۔ دنیا کا یہ تسلیم شدہ عالمی اُصول ہے کہ دریاؤں پر آخری اور فیصلہ کن حق نچلے فریق (Lower Riparian) کا ہوتا ہے اور ان کی مرضی اور قانونی اجازت یا رضامندی و معاہدے کے بغیر اوپر والے حصیدار (Upper Riparian) کو دریا پر ڈیم تعمیر کرنے، پانی چُرانے یا کوئی بھی آبپاشی کا منصوبہ بنانے کا اختیار نہیں ہوتا۔ لیکن پنجاب برطانوی دوَر سے لیکر آج تک اس عالمی اُصول کی مسلسل انحرافی کرتا آیا ہے۔ تاریخ کی ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ پنجاب اپنے سیاسی کردار کی وجہ سے انگریز سامراج کا منظور نظر صوبہ بنا ہوا تھا، کیونکہ پنجاب نے ہمیشہ انگریزوں کا ہی ساتھ دیا تھا۔ جبکہ سندھ اس کے مقابلے میں ایک نظرانداز کیا ہوا اور دیوار سے لگا ہوا علاقہ تھا، جس کو انگریزوں نے بمبئی سے ملا کر

محظ ایک ڈویزن تک محدود کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود آج کے پاکستان کی نسبت سندھ کو انگریز سرکار میں پھر بھی پانی کا جائز حصہ ملتا رہا اور سندھ انڈس بیسن دریاؤں یعنی سندھو، جہلم، چناب، راوی، بیاس اور ستلج کے پانی میں نچلے فریق (Lower Riparian) کی حیثیت میں حصیدار تھی۔ لیکن پنجاب کی اختیاریوں نے برطانوی سرکار میں اپنی مراعت یافتہ حیثیت کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے انڈس بیسن دریاؤں پر ناجائز طور پر ڈیم اور کینال تعمیر کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جس کا ثبوت ۱۸۵۵ء سے ۱۹۰۱ء کے درمیان تعمیر شدہ سرہند کینال، لوئر پنجاب کینال اور لوئر جہلم کینال ہیں۔ اس طرح ۱۹۰۸ء میں پہاڑپور کینال اور ۱۹۱۷ء میں اپر سوات کینال تعمیر کئے گئے۔ جو کہ سراسر ناجائز اور غیر قانونی تھے۔ ۱۹۱۵ء میں پنجاب کی اختیاریوں نے سہ۔کینالی منصوبہ شروع کیا۔ جس کے تحت ناجائز طور پر جہلم کینال، چناب کینال اور لوئر باری کینال تعمیر کئے گئے، لیکن پنجاب کی طرف سے مشترکہ حقوق کے احترام کی تمام حدود پار کرتے ہوئے ۱۹۱۹ء میں جب ستلج ویلی منصوبے کی غیر قانونی تعمیر شروع کی گئی، جس میں گیارہ کینال اور چار دیگر آبپاشی منصوبے شامل تھے، تب جاکر برطانوی سرکار نے بھی اس کا نوٹس لیا اور اس طرح یہ معاملہ مرکزی سرکار کی جانب گیا اور انگیز سرکار کی جانب سے "کاٹن کمیشن" کا قیام عمل میں آیا اور اس کمیٹی نے پنجاب کے اس فیصلے کو یہ کہتے ہوئے رد کیا کہ پنجاب آخر والے نچلے فریق یعنی سندھ کی مرضی کے بغیر انڈس بیسن دریاؤں پر کوئی بند یا کینال تعمیر نہیں کر سکتا۔ جب پنجاب کی طرف سے یہ حق تلفی اور مشترکہ حقوق کی انحرافی بند نہ ہوئی تو ۱۹۳۵ء میں ایک مرتبہ پھر انگریز سرکار کی طرف سے "اینڈرسن کمیٹی" بنائی گئی، جس میں پنجاب کا یہ اعتراض بھی شامل کیا گیا کہ سندھ کو سکھر بیراج بنانے کا کوئی بھی اختیار نہیں ہے۔ کمیٹی نے ۳۰ مارچ ۱۹۳۵ء کو اپنی رپورٹ جاری کی لیکن اس رپورٹ کی بنیاد پر حکومت کی طرف سے حتمی رپورٹ ۳۰ مارچ ۱۹۳۷ء کو جاری کی گئی اور فیصلہ سنایا گیا۔ پنجاب نے ایک دن کے لئے بھی خاموشی اختیار نہیں کی اور اس نے اپنے ناجائز اور غیر قانونی آبپاشی کے منصوبے بنانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ پاکستان کے حکمرانوں کی نسبت انگریز سامراج کی حکومت بھی ایک حد تک انصاف پسند تھی، جس نے پنجاب کی مراعت یافتہ حیثیت کے باوجود ہمیشہ پانی کی انصاف پسند تقسیم پر زور دیا اور پنجاب کو اس معاہدے کا پاس رکھنے کا پابند رکھنے کی کوشش کی۔ جس کی مثال ۱۹۴۵ء کا سندھ طاس معاہدہ ہے۔ یہ معاہدہ کلکتہ ہائی کورٹ کے اُس وقت کے چیف جسٹس رائے (جس کے نام سے رائے کمیشن قائم ہوئی) کی قیادت

میں کیا گیا، جس کو ہندوستان کی مرکزی سرکار کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا۔ کیونکہ سندھ نے ایک بار پھر ۱۹۳۹ء میں انگریز حکومت کے آگے اعتراض درج کروایا تھا کہ بکھر اڈیم کے نام پر پنجاب سندھ کا پانی چوری کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ رائے کمیشن نے واضح طور پر پنجاب کے اس موقف کو مکمل طور پر رد کیا کہ پنجاب کو مشترکہ پانی پر آخر والے نچلے فریق یعنی سندھ کی مرضی کے بغیر کوئی منصوبہ بنانے کا اختیار ہے۔ رائے کمیشن کی سفارشات اور فیصلوں کے نتیجے میں ۱۹۴۵ء میں سندھ - طاس پانی معاہدہ عمل میں آیا، جس پر سندھ اور پنجاب کی اختیاریوں اور متعلقہ حکام نے دستخط کئے لیکن المیہ یہ ہے کہ پنجاب نے اس کے بعد بھی اپنے پانی کی لوٹ مار کے سلسلہ کو نہیں روکا اور پنجاب نے مختلف منصوبوں کی صورت میں یہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ جاری رکھا۔

پاکستان بننے کے بعد جب پاکستان کی طرف سے بھارت کے ہاتھ "انڈس بیسن ٹریٹی" کے نام پر معاہدہ کیا گیا تو اُس وقت ملک میں ون یونٹ نافذ تھا اور ان دنوں سندھ سے قومی تو کیا صوبائی حیثیت بھی چھین لی گئی تھی اور سندھ کو ان نام نہاد معاہدوں کے تمام مراحل اور معاملات میں شامل نہیں کیا گیا اور پنجاب نے مرکز کے نام پر مشترکہ پانی کے تین دریا بھارت کو بیچ دیئے، جن پر انگریز دور سے لیکر سندھ کا قانونی حق تسلیم کیا گیا تھا۔ تربیلا اور منگلا ڈیم کے وقت بھی یہ ہی ہوا اور نہ صرف سندھ کو اس میں سے مطلوبہ حصہ کبھی نہیں ملا بلکہ سندھ کی زراعت، سمندر کے اندر تمر کے قیمتی اور نایاب جنگلات (Mangrove Forests) اور دریا پر منحصر ساری حیات کو بہت بڑا نقصان ہوا۔

> "پانی کا تنازعہ سندھ اور پنجاب کے درمیان بہت پرانا ہے۔ اس کی سادہ مثال یہ ہے کہ اس وقت تک اس حوالے سے چھ کمیشن بن چکے ہیں، جن میں یہ تنازعہ حل کرنے کے لئے سفارشات ترتیب دی گئیں، لیکن تنازعہ اپنی جگہ پر آج تک نہ صرف جوں کا توں موجود ہے، بلکہ دن بدن بڑھتا ہوا تیز ہو رہا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں "اینڈرسن کمیشن" بنائی گئی۔ ۱۹۴۱ء میں "انڈس راؤ کمیشن" بنی، ۱۹۶۸ء میں "اختر حسین کمیشن" بنائی گئی، ۱۹۷۰ء میں "فضل اکبر کمیشن" ترتیب دی گئی، ۱۹۸۱ء میں "حلیماں کمیشن" بنی، لیکن پاکستان میں صوبوں خصوصاً سندھ اور پنجاب کے درمیان پانی کا تنازعہ حل نہ ہو سکا۔ ۱۹۹۱ء میں پانی معاہدہ کے نتیجے میں انڈس رِور سسٹم اتھارٹی یعنی "ارسا" کا قیام بھی اسی وجہ سے عمل میں لایا گیا کہ یہ اتھارٹی پانی معاہدی کے مطابق پانی کی صحیح تقسیم کو یقینی بناکر تنازعہ کو حل کرنے میں کردار ادا کرے گی لیکن اس کے برعکس نہ صرف

پانی کی تقسیم انصاف کے تقاضائون پر نہ اُتر سکی بلکہ واپڈا کی طرح وہ بھی پنجاب حکومت کے ہاتھوں میں کھیلتی رہی اور بدستور کھیل رہی ہے۔"[1]

"خود ۱۹۹۱ء کا پانی معاہدہ بھی جام صادق کی غیر نمائندہ حکومت کی معرفت سندھ پر زبردستی مسلط کیا گیا تھا۔ سندھ کے ماہرین، عوام اور سیاسی پارٹیوں نے اُس وقت بھی اس معاہدے کی سخت مخالفت کی تھی۔ اس کا پورا رکارڈ آج بھی موجود ہے، لیکن آج پنجاب حکومت اور وفاق اس پر بھی عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مثلاً ۱۹۹۱ء کے پانی معاہدے کے مطابق جب تک کوٹڑی ڈائون اسٹریم کے نیچے پانی کی لازمی رسائی کا معاملہ طے نہیں ہوتا، تب تک پانی کی تقسیم کے حوالے سے کوئی بھی منصوبہ انڈس پر نہیں بنایا جاسکتا، لیکن اس کے باوجود ایک طرف ۱۹۹۱ء سے لیکر معاہدے کے مطابق ڈائون اسٹریم کوٹڑی کے نیچے پانی چھوڑنے کے حوالے سے کوئی بھی اسٹڈی نہیں کروائی گئی اور نہ ہی طے شدہ پانی دیا گیا ہے، جس کی کوئی بھی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ نتیجے میں ڈائون اسٹریم کوٹڑی کے نیچے پانی نہ دینے کی وجہ سے سمندر کے اُبھار سے سندھ کے دو اضلاع بدین اور ٹھٹہ تباہ ہوگئے ہیں۔ لاکھوں ایکڑ زرعی زمین نمکین ہونے کی وجہ سے نہ صرف قابلِ کاشت نہیں رہی بلکہ ماحولیاتی تباہی کا سبب بن گئی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ڈائون اسٹریم کوٹڑی کے نیچے پانی نہ دینے کی وجہ سے سندھ کی 19 لاکھ ایکڑ زمین پر مشتمل دریائی زمین بھی تباہ ہو گئی ہے۔ خود انڈس ڈیلٹا میں جو تمر کے جنگلات ہیں، وہ مسلسل بری طرح تباہ ہو رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کے تمر کے بڑے جنگلات میں چھٹے نمبر پر ہیں، جو کہ 650،000 ایکڑوں پر مشتمل ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں IUCN نے اس ضمن میں ایک رپورٹ شایع کی تھی، کہ انڈس ڈیلٹا کا محفوظ رہنا اور بڑھنا سندھ کی ماحولیات، معیشت اور ترقی کے لئے بیحد ضروری ہے۔ گذشتہ ۱۰ برسوں سے کوٹڑی ڈائون اسٹریم کے نیچے پانی نہ جانے کی وجہ سے وہ جنگلات مسلسل تباہ ہو رہے ہیں، اور صورتحال بدستور یوں ہی رہی تو کچھ برسوں میں دنیا کا یہ چھٹہ نمبر قدیم ڈیلٹا مکمل طور پر تباہ ہو جائیگا۔ جس کا بڑا حصہ پہلے ہی پانی کی کمی، سمندر کی توسیع اور سمندر کی طرف میٹھے پانی کی رسد بند ہونے کی وجہ سے تباہ ہو چکا ہے۔ دریائے سندھ کے دونوں اطراف سے کچے کی (دریائی زمین) سراسری طور پر 19 لاکھ ایکڑ ہے، جس میں سے چھ لاکھ ایکڑ گھنے جنگلات پر مشتمل رہی ہے، جبکہ باقی حصہ بہت زرخیز زمین اور چراگاہوں پر مبنی رہا ہے اور وہ بھی اب تیزی سے تباہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ان زمینوں، جنگلات اور چراگاہوں کی زندگی کا انحصار دریائے سندھ میں سیلاب پر رہا

[1] جامی چانڈیو: "تبديليءَ جا محرڪ ۽ سنڌ جو آئيندو"، ترتیب: منیر چانڈیو، سینٹر فار پیس اینڈ سول سوسائٹی حیدرآباد، ۲۰۰۷ء، ص: 107-106۔

ہے۔ جتنا پانی کم آئیگا اتنا ہی وہ علاقے سال کے تین مہینے یعنی جولائی، اگست اور ستمبر میں پانی کے نیچے ہونگے۔ ان کو وہ قدرتی نمی اور طاقت میسر نہ ہوگی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ سبزیوں، دالوں، لکڑی اور مال مویشی کے حوالے سے بھی یہ عناصر بہت بڑی معاشی قوت رکھتے ہیں اور کم و بیش 13 لاکھ لوگوں کا ذریعہ معاش ہیں۔ آگے چل کر سندھو کا یہ پانی جہاں بحرِ عرب میں پڑتا ہے، وہاں چھ لاکھ پچاس ہزار ایکڑ کے گھنے سمندری تمر کے جنگلات ہیں، جو اب کہا جاتا ہے کہ سکڑ کر ایک لاکھ تک رہ گئے ہیں۔ ان جنگلات کی معاشی اور ماحولیاتی قدر و قیمت بہت بڑی ہے، جو کہ مچھلی، جھینگوں اور پلے کی نرسری ہے۔ اس کے علاوہ سندھ کے جنوب کے عام جانور خصوصاً اونٹ کی سب سے بڑی چراگاہ بھی ہے اور وہاں کے لوگوں کے لئے جلانے والی لکڑی کا سب سے بڑا ذریعہ بھی ہے۔ اس پورے علاقے میں تقریباً 20 لاکھ افراد کا ذریعہ معاش سمندری اور میٹھے پانی کی مچھلی، لکڑی، مال مویشی ہے اور اب وہ تمام نایاب وسائل پانی کی عدم دستیابی اور لوٹ مار کی وجہ سے تباہ ہو رہے ہیں۔"[2]

پانی کا تنازعہ ملکی وفاق کے لئے مستقل خطرہ اور سندھ کے لئے زندگی و موت کا مسئلہ ہے۔ ملک میں ایوب خان کی حکومت ہو یا شہید بھٹو کی، ضیا الحق کی ہو یا نواز شریف کی، پرویز مشرف کی ہو یا پیپلز پارٹی کی، لیکن کوئی بھی حکومت ملک میں ابھی تک پانی کی تقسیم کا فیصلہ عالمی قوانین اور انصاف کے بنیادوں پر نہیں کر سکی اور نہ ہی موجودہ ریاستی ڈھانچے اور طاقت کے توازن میں شاید کر سکتی ہے۔ کیونکہ ملک کے اصل اختیار و اقتدار کے مالک حکمران طبقے اور اسٹبلشمینٹ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج بھی ناجائز طور پر گریٹر تھل کئنال کی تعمیر دن رات جاری ہے اور واپڈا کے ویژن ۲۰۲۵ء کے مطابق آبپاشی کے وہ تمام منصوبے رواں ہیں اور دوسروں کے لئے تیاریاں ہو رہی ہیں، جن کو فیصلہ کن فریق کی حیثیت سے سندھ مسلسل رد کر چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس نام نہاد صوبائی خود مختاری میں سندھ کو اپنے پانی کا جائز حصہ نہ مل سکے اور پنجاب کی طرف سے ڈیڑھ صدی کے بعد بھی جاری پانی کی چوری اور سینہ زوری کو روکا نہ جا سکے تو پھر وہ نام نہاد خود مختاری کیسی اور کس کام کی؟

---

[2] جامی چانڈیو: "تبدیلیءَ جا محرک ۽ سنڌ جو آئیندو"، ترتیب: منیر چانڈیو، سینٹر فار پیس اینڈ سول سوسائٹی حیدرآباد، ۲۰۰۷ء، ص: 107-109

سندھ کو وہ قومی خود مختاری چاہیئے، جس میں سندھ کو اختیار حاصل ہو کہ جس میں وہ نہ صرف اپنا پانی کا جائز حصہ لے سکے بلکہ ڈیڑھ صدی سے جاری اس بہیمانہ استحصال، چوری اور سینہ زوری کو بھی روک سکے۔

ثقافتی خود مختاری:

قوموں کی قومی تعمیر و ترقی محظ سیاسی اور معاشی ذرائع سے نہیں بلکہ ترقی پسند ثقافتی قوت اور ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ پاکستان میں جس طرح سیاسی اور معاشی معاملات پر پنجاب کے حکمران طبقات کی اجارہ داری رہی ہے، اسی طرح پاکستان میں ثقافتی تسلط اردو زبان اور اس کے نام نہاد قومی کلچر کا رہا ہے۔ پاکستان کا کوئی ایک قومی کلچر نہ ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ گذشتہ چھ دھائیوں سے جس شیروانی کلچر کو پاکستانی کلچر کہا جاتا ہے، وہ ملک کی ایک ثقافتی اقلیت کا ہندوستانی کلچر ہے، جس کا اس ملک کی کسی بھی تاریخی قوم کے کلچر سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ پاکستان ایک کثیر قومی، لسانی، نسلی اور ثقافتی ملک ہے، جہاں تاریخی قوموں کی اپنی اپنی پہچان، وطنی حیثیت، زبان، ثقافت، ادب، شاعری کی مختلف و منفرد روایات رہی ہیں۔ پاکستان کے قیام سے لیکر آج تک ملک کی تمام قوموں پر ایک مراعت یافتہ ثقافتی اقلیت یعنی اردو بولنے والی آبادی کی زبان اور ہندوستانی کلچر کو پاکستانی کلچر اور ثقافتی وحدت کی علامت کے طور پر اُبھارنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس ثقافتی تسلط اور جبر نے ملک میں سیاست، معیشت اور ریاست کے دیگر شعباجات کی طرح ثقافت جیسی لطیف چیز کو بھی بیحد متضاد اور متنازعہ بنا دیا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی تحریک کی بنیادوں میں بھی ایک سبب یہ پنہاں تھا کہ بنگال جیسی ثقافتی حوالے سے امیر اور تاریخی قوم کو اردو کی ثقافتی اجارہ داری کسی بھی صورت میں قبول نہ تھی۔ بنگال کے علاوہ سندھیوں نے بھی ون یونٹ کے دوٗر سے لیکر آج تک اس ثقافتی جبر کی مسلسل مزاحمت کی ہے، جو کہ آج تک جاری ہے، لیکن ریاست اور اس پر قابض حکمران طبقات آدھا ملک کھونے کے باوجود تاریخ کے معروضی حقائق سے کوئی سبق حاصل کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ پاکستان میں صوبائی خود مختاری صرف اسی صورت میں صحیح معنوں میں صوبوں کی خود مختاری کہلائے گی جب قوموں کی تاریخی زبانوں اور ثقافتوں کو قومی درجہ دیا جائیگا اور ان کو آئینی تحفظ بھی فراہم کیا جائیگا۔ جب تک صوبے اپنی قومی، ثقافتی، لسانی اور تعلیمی پالیسیاں بنانے میں خود مختار اور آزاد نہ ہونگے تب تک فقط دکھاوے کی

خاطر نام نہاد صوبائی خود مختاری ملک کی مظلوم قوموں کے ساتھ ایک اور بڑے سنگین مذاق کے علاوہ اور کسی بھی حیثیت کی حامل نہیں ہو سکتی۔

پاکستان کی ریاست اس لحاظ سے ایک بدقسمت ریاست ہے، جس نے اپنی اصل خوبصورتی اور قوت یعنی کلچرل ڈائیورسٹی سے انکار کیا، جس کو ہم مختلف زبانوں، قوموں، نسلوں، ثقافتوں اور مذاہب کی دھنک بھی کہہ سکتے ہیں۔ پاکستان کی کثیر ثقافتی اور لسانی حیثیت اصل میں اس کی ایک قوت تھی، جس کو ریاست کے خود فریب انکار کی وجہ سے ایک کمزوری اور لامتناہی تضاد میں تبدیل کر دیا گیا۔ دنیا جہان میں ڈائوَرسٹی اور پلیورلزم کو ایک سماجی قوت، خوشبختی کی علامت اور اجتماعی خوبصورتی سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن پاکستان نے اپنی اس قوت کو ایک بدترین تضاد اور کمزوی میں تبدیل کر دیا۔

پاکستان کے وفاق، قومی/ صوبائی خود مختاری اور قومی سوال کے اس بحث میں نقطۂ نظر کا حاصل مطلب یہ ہے کہ جب تک پاکستان کے بنیادی ڈھانچے، طاقت کے توازن اور مفادات میں تبدیلی لاکر، صوبوں میں بسنے والی تاریخی قوموں کو محظ صوبائی نہیں بلکہ قومی خود مختاری دیکر اور ملک کی خالق قوموں کے درمیاں، ایک نئے سماجی معاہدے کی بنیاد پر ایک ایسے حقیقی جمہوری وفاق کی بنیاد نہیں رکھی جاتی، جس کی بنیاد ۱۹۴۰ء کی قرارداد پر ہو، تب تک باقی تمام صوبائی خود مختاری کے حوالے سے دکھاوے کی خود فریب کوششیں ملک کے پیچیدہ ریاستی بحران کو مزید سنگین تو کر سکتی ہیں، لیکن اس کا کوئی انصاف پر مبنی پائدار جمہوری حل نہیں نکال سکتیں۔

جمہوری وفاقیت کے بحران کے نتائج:

آج پاکستان میں جو بھی ہمہ گیر ریاستی بحران نظر آتا ہے، اُس کی ایک بنیادی وجہ ملک میں جمہوری وفاقیت کی اصل روح اور نظام سے انحرافی ہے۔ آج پاکستان کو دنیا جہان میں ایک ناکام ریاست اس لئے بھی کہا جاتا ہے، پاکستان میں جمہوری روایات اس لئے بھی کمزور ہیں اور ملک میں تضادات اس لئے بھی سنگین خطرات کی شکل اختیار کر چکے ہیں، کیونکہ ملک کی ریاستی باگ ڈور ایک مخصوص مفاد پرست گروہ کے ہاتھ میں مقید ہے۔ اختیارات کی مرکزیت کا محور عوام یا اس ملک کی اقوام اور اُن کی نمائندہ منتخب اسیمبلیاں اور پارلیامینٹ

نہیں بلکہ ایک مخصوص جمہوریت دشمن مفاد پرست گروہ ہے۔ اگر پاکستان میں ریاست اور وفاق کی بنیاد ۱۹۴۰ء کی قرارداد کی روح کے مطابق رکھی جاتی اور شروع سے جمہوری وفاقیت کی جڑیں مضبوط کی جاتیں، اختیارات کی عدم مرکزیت کو فروغ دیا جاتا، فیصلہ سازی جمہوری طریقے سے اور ملک کی تمام اقوام کے عوام کی یقینی اور برابری کی شرکت سے کی جاتی، پاکستان کو ایک کثیر قومی، کثیر لسانی، کثیر ثقافتی اور کثیر مذہبی ریاست تسلیم کیا جاتا تو شاید پاکستان کے مجموعی حالات اتنے پیچیدہ، بحرانی اور سنگین نہ ہوتے، جتنے کہ آج ہیں۔

آج کے پاکستان کی ریاستی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی صورتحال دیکھ کر ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر پاکستان اپنا وجود برقرار رکھ سکتا ہے اور اپنی کمزوریوں کو قوت میں تبدیل کر سکتا ہے تو ہمیں ۱۹۴۰ء کی قرارداد کی روح اور معاہدے سے رجوع کرنا پڑے گا اور مندرجہ ذیل مطالبات کو تسلیم کرکے ایک سیکیولر، جمہوری، فلاحی اور قوموں کی برابری اور آزادی پر استوار جمہوری وفاق کی بنیاد رکھنا ہوگی۔

مظلوم قوموں اور عوام کے جمہوری مطالبات:

- اگرچہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد اور معاہدے اور اتفاق رائے پر مبنی پاکستان تو معرضِ وجود میں نہیں آ سکا لیکن ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان یعنی بنگال کی علیحدگی کے بعد موجودہ پاکستان اپنا اصل استحقاق کھو چکا ہے۔ ۱۹۷۱ء کے بعد کا پاکستان عملی طور پر وہ پاکستان ہے، جس کا تصور علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں پیش کیا تھا اور جس کو اُس وقت مسلمان اکثریتی علائقوں کی طرف سے بھی رد کیا گیا تھا۔ سندھ صرف اس پاکستان میں شامل رہنے کے لئے پابند ہے، جس کی بنیاد ۱۹۴۰ء کی قرارداد اور ۳ مارچ ۱۹۴۳ء میں پاکستان کے حق میں سندھ اسیمبلی کی طرف سے منظور کی ہوئی قرارداد پر ہو۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستان میں وفاق اور اکائیوں/ قوموں کے درمیاں ایک نیا سماجی معاہدہ تشکیل دیا جائے، جس کی بنیاد ۱۹۴۰ء کی قرارداد اور جمہوری وفاق کے جدید عالمی اُصولوں اور تقاضائوں پر رکھی جائے۔
- پاکستان کا غیر سیکیولر نام تبدیل کرکے اس کا نام "عوامی جمہوریہ پاکستان" رکھا جائے۔
- ۱۹۷۳ء کا آئین قوموں کے وجود سے انکار، غیر سیکیولر مزاج، مسلسل غیر جمہوری مداخلت اور آئین سے ماوراترامیم اور مرکزیت پسندی کی وجہ سے اپنی اہمیت و افادیت مکمل طور پر کھو

چکا ہے، اس لئے موجودہ آئین ملک میں موجود سنگین سیاسی اور معاشی بحران کو حل کرنے کا اہل نہیں رہا، اس لئے ۱۹۷۳ء کے آئین میں سے تمام غیر جمہوری ترامیم ختم کر کے، اس کو صرف ایک عبوری آئین کی حیثیت دے کر ایک نئی آئین ساز اسیمبلی کے ذریعے نیا آئین بنایا جائے۔ یہ نیا آئین پاکستان کے چاروں صوبوں اور اس میں بسنے والی تاریخی قوموں کے درمیاں ایک نئے "سماجی معاہدے" کا کام دے سکتا ہے، جس میں قوموں کی تاریخی حیثیت اور انکے تاریخی سیاسی، معاشی، ثقافتی اور باقی قومی حقوق کو مکمل طور پر تسلیم کیا جائے۔

- صوبوں میں وزرائے اعلیٰ کی جگہ دنیا کی مختلف وفاقی ریاستوں کی طرح خود مختار وزرائے اعظم کے عہدے رکھے جائیں، کیونکہ خود برِصغیر میں برطانوی دوَر میں بھی صوبوں میں وزرائے اعلیٰ نہیں بلکہ وزرائے اعظم کے منصب ہوتے تھے۔
- وفاقی پرچم کے علاوہ ہر صوبے کو اپنا الگ جھنڈا رکھنے کا آئینی اختیار دیا جائے، جیساکہ آمریکا اور جرمنی کی طرح دنیا کی بیشتر وفاقی جمہوری مملکتوں میں یہ ایک مروج روایت ہے۔
- عبوری آئین میں سے کنکرنٹ لسٹ کو ختم کر کے، وفاق کو صرف چار شعبے یعنی خارجہ پالیسی، دفاع، کرنسی اور بین الصوبائی مواصلات دیئے جائیں۔ جب کہ سیلز ٹیکس کے ساتھ باقی تمام صوبائی ٹیکس اور محکمے صوبوں کو واپس لوٹائے جائیں۔
- وفاقی سطح پر ۱۹۴۰ء کے مطابق نئے آئین کی حفاظت کے لئے آمریکا، کنیڈا، جرمنی، آسٹریلیا اور دوسرے بہت سے وفاقی ملکوں کی طرح ایک آئینی کورٹ (Constitutional Court) قائم کی جائے، جس کے ذمے آئین کے تحفظ کے ساتھ قوموں/ صوبوں کے درمیان باہمی جمہوری رشتوں، اختیارات یا وسائل کی تقسیم کو توازن میں رکھنا بھی شامل ہو۔
- صوبوں میں بسنے والی تاریخی قوموں کی دائمی اکثریتی حیثیت کو تسلیم کر کے ان کا اپنے تاریخی وطنوں پر مستقل حقِ حاکمیت تسلیم کیا جائے اور اس کے مستقل تحفظ کے لئے ان کو آئینی ضمانت دی جائے۔
- صوبے محظ انتظامی یونٹ نہیں بلکہ مقامی قوموں کے تاریخی وطن ہیں۔ اس لئے ریاست کو کوئی بھی اخلاقی اور آئینی اختیار نہیں ہے کہ وہ دھرتی کے اصل مالکوں کی مرضی اور ان کے تاریخی حقوق کے خلاف صوبوں کی جاگرافیائی حدود کو تبدیل کرے یا ملک میں مزید صوبوں کی بات کرے۔ یہ بات سرائیکی صوبے پر اس لیے لاگو نہیں کہ سرائیکی ایک الگ قومیت

ہیں اور تاریخی طور پر وہ پنجاب کا حصہ نہیں رہے۔ اس لیے سرائیکی صوبہ کے جائز سوال کو سندھ کے لیے ایک بلیک میلنگ کے کارڈ کے طور پر استعمال نہ کیا جائے۔

- سندھ میں غیر قانونی طور پر رہنے والے 35 لاکھ غیر ملکیوں کو واپس اپنے اپنے ملک بھیجنے کا بندوبست کیا جائے اور جب تک وہ واپس ہو سکیں، تب تک تمام غیر ملکیوں کی مکمل رجسٹریشن کی جائے اور ان کو کوئی سیاسی و آئینی حق نہ دیا جائے۔ البتہ ان کے انسانی حقوق کا تحفظ ہر قیمت پر ضروری ہے۔
- پاکستان کے وفاقی ادارے کسی بھی طرح وفاقی ادارے کہلانے کے حقدار نہیں ہیں، کیونکہ ان پر پنجاب اور ایک لسانی گروہ کے حکمران طبقے کی اجارہ داری رہی ہے۔ اس لئے تمام وفاقی اداروں اور بیوروکریسی میں چاروں صوبوں اور اس میں بسنے والی تاریخی قوموں کے عوام کو میرٹ کی بنیاد پر برابر نمائندگی دی جائے۔
- عوامی معاملات یا سیاست میں فوج کا کوئی بھی کردار نہیں ہونا چاہیئے۔ فوج کی تعداد میں کمی کر کے پاکستان کی فوج کو حقیقی معنوں میں وفاقی فوج بنانے کیلئے تمام صوبوں اور اس میں بسنے والی تاریخی مقامی قوموں کو برابر نمائندگی دی جائے۔
- پاکستان کی دفاعی بجیٹ نہ تو شفاف طریقے سے طے ہوتی ہے اور نہ خرچ۔ اس لئے لازمی طور پر یہ بجیٹ پارلیامینٹ کے دونوں ایوانوں میں بحث کے لئے پیش ہونی چاہیئے اور پارلیامینٹ کے ساتھ چاروں صوبائی اسیمبلیوں کی مشترکہ منظوری کے بعد ہی دفاعی بجیٹ کو پاس کیا جائے۔
- پاکستان میں حقیقی جمہوری وفاق کبھی بھی نہیں رہا بلکہ خصوصاً مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد پاکستانی وفاق سخت عدم توازن کا شکار رہا ہے۔ ایک بالادست صوبے کو پارلیامینٹ میں باقی تینوں صوبوں پر عددی اور سیاسی برتری حاصل ہے اور وہ صوبہ ایسی اکثریت کی بنا پر تمام ریاستی معاملات میں اپنی اجارہ داری اور مرضی کا مالک ہے۔ اختیارات کی ایسی مرکزیت پاکستان میں صوبائی اور قومی تنازعات کی اصل بنیاد ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ تمام صوبوں کو سینیٹ میں یکساں نمائندگی دی جائے اور ان کی برابر حیثیت کو قبول کیا جائے لیکن اس کے لئے لازم ہے کہ ہر صوبے سے سینیٹ کی نمائندگی کے لئے کم سے کم 2/3 اکثریت صوبے کے مقامی اور اصل باشندوں سے ہو۔

- صوبوں اور اس میں بسنے والی تاریخی قوموں کی نمائندہ سینیٹ کو یہ اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ بجیٹ، دفاعی اخراجات اور مانیٹری بلوں کو پاس یا ویٹو کرسکے۔ ساتھ میں دوسرے ممالک کے ساتھ ہونے والے معاشی اور سفارتی معاہدوں کی چھان بین اور حتمی منظوری بھی سینیٹ سے ہونی چاہیئے۔
- وفاقی سطح پر ہونے والی تمام تقرریوں کی توسیع سینیٹ سے ہونی چاہیئے، جس میں سپریم کورٹ کے جج صاحبان، چیف الیکشن کمشنر، فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے ممبران، سفیر، خودمختار اداروں اور کارپوریشنس کے سربراہ، گورنرز اور مسلح افواج کے سربراہ آجاتے ہیں۔
- کائونسل آف کامن انٹریسٹ، چاروں وفاقی اکائیوں کی حقیقی نمائندہ ہونی چاہیئے۔ جو کہ مستقل بنیادوں پر اجلاس کی صورت میں صوبوں کے درمیاں جمہوری رابطوں کی بحالی اور تضادات کو حل کرنے کا کردار ادا کرتی رہے۔
- سندھ میں آرمی اور وفاقی بیوروکریسی کو دی گئی تمام زمین ان سے واپس لیکر بے زمین کسانوں کو دی جائے۔
- موجودہ ضلعی نظام صوبائی خودمختاری کی نفی اور حد سے زیادہ مرکزیت پسند ہے۔ اس لئے موجودہ ضلعی نظام کو ختم کرکے صوبوں کے اپنے اصل میونسپل نظام کو کچھ مزید جمہوری ترامیم کے ساتھ بحال کیا جائے۔
- گورنر کا عہدہ ختم کیا جائے یا اس کے آئینی اختیار کم کیئے جائیں۔ (خصوصاً صوبائی حکومت یا اسیمبلی کو ختم کرنے کے اختیار)
- صوبائی بورڈ آف روینیو کو قائم رکھتے ہوئے وفاقی بورڈ آف روینیو کو ختم کیا جائے۔
- پانی کا تنازعہ ملک میں اہم تنازعہ کی حیثیت حاصل کرچکا ہے۔ سندھ دریائے سندھ کے آخر میں ہے۔ اس لئے اس پر پانی کے حوالے سے سب سے پہلا اور بنیادی حق سندھ کا ہے۔ پاکستان کے آئین یا عالمی قوانین کے مطابق آخر والوں کا دریا پر اولین اور آخری حق تسلیم کیا گیا ہے۔ سندھ کو دریائے سندھ پر مزید کوئی بئراج، ڈیم یا کئنال وغیرہ منظور نہیں ہے، اور آخر میں آنے والے فریق کی حیثیت میں یہ سندھ کا آئینی اور تاریخی حق ہے۔ اس لئے گریٹر تھل کئنال کی غیر قانونی تعمیر فوری طور پر روکی جائے اور دریائے سندھ پر سندھ سے اوپر مزید کوئی بھی ڈیم، کئنال یا بئراج تعمیر نہیں کیا جائے۔ پرویز مشرف کی طرف سے بدنیتی

سے تیار کیا ہوا واپڈا کا نام نہاد Vision 2005 دریائے سندھ کا قاتل منصوبہ ہمیشہ کے لئے ختم کیا جائے۔
- واپڈا کو ختم کرکے پانی اور بجلی کے شعبے اور ذمیواریاں مکمل طور پر صوبوں کے حوالے کی جائیں۔
- تمام صوبوں میں پانی کی انصاف پر مبنی تقسیم کو ۱۹۴۵ء کے سندھ طاس معاہدے کے تحت عمل میں لایا جائے۔
- قدرتی اور مالیاتی وسائل کے تمام اختیارات مکمل طور پر صوبوں کے حوالے کیئے جائیں اور جہاں سے بھی تیل، گئس، کوئلہ یا دوسرے معدنیات ملیں، اس کی صرف 25 فیصد رائلٹی وفاق، 25 فیصد متعلقہ ضلع اور 50 فیصد اس صوبے کو دی جائے، جہاں سے بھی تیل ملے اس کی لیز کے اختیار بھی اسی صوبے کو حاصل ہوں۔
- پاکستان کی تمام زبانوں پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، سرائیکی، ہندکو اور باقی زبانوں کو قومی زبانوں کا درجہ دیا جائے۔ اردو اور انگریزی کا درجہ صوبوں میں رابطے کی زبانوں کا ہو۔
- صوبوں کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ اپنی زبان اور تعلیم کے حوالے سے اپنی تاریخی، قومی، سماجی اور ثقافتی ترجیحات کے مطابق پالیسیاں مرتب کرسکیں۔
- کئناڈا کی طرح صوبوں اور ان میں بسنے والی تاریخی قوموں کو وفاقی معاہدوں پر عمل نہ ہونے کی صورت میں وفاق سے علیحدگی کا رضاکارانہ جمہوری حق (Right of self determination) دیا جائے۔

Bibliography:

Books

1. Adeney, Katharine. *Federalism and Ethnic Conflict Regulation in India and Pakistan.* New York: Palgrave MacMillan, 2007.
2. Ali, Mehrunnisa. *Politics of Federalism in Pakistan.* Karachi: Royal Book Company, 1996.
3. Amoretti, Ugo and Nancy Bermeo, eds. *Federalism and Territorial Cleavages*. Baltimore: Johns Hopkins, 2004.
4. Aziz, K.K. *The Making of Pakistan: A Study in Nationalism.* Lahore: Sand-E-Meel, 2005.
5. Cheema, Pervaiz Iqbal and Rashid Ahmad Khan, eds. *Problems of Federalism in Pakistan*. Islamabad: Islamabad Policy Research Institute, 2006.
6. Cohen, Stephen Philip. *The Idea of Pakistan*. Washington D.C.: Brookings, 2004.
7. Joyo, Mohammed Ibrahim. *Save Sindh, Save the Continent*. Hyderabad: Sindh Democratic Party, 2000.
8. Kazimi, M.R. *Pakistan Studies.* Karachi: Oxford, 2007.
9. Khan, Hamid. *Constitutional and Political History of Pakistan.* Karachi: Oxford, 2005.
10. Nazir, Muntzra. *Federalism in Pakistan: Early Years.* Lahore: Pakistan Study Centre, 2008.
11. Palijo, Rasul Bux. *Sindh-Punjab Water Dispute 1859-2003.* Hyderabad: Center for Peace and Human Development, 2003.
12. Syed, G.M. *The Case of Sindh — G.M. Syed's Deposition in Court (Part 1).* Karachi: Naeen Sindh Academy. http://www.sindhudesh.com/gmsyed/case/saeen-book1.htm

13. Talbot, Ian. *Pakistan: A Modern History*. London: Hurst, 2005.
14. Waseem, Mohammad. *Politics and the State in Pakistan*. Islamabad: National Institute of Historical and Cultural Research, 2007.
15. Ziring, Lawrence. *Pakistan in the Twentieth History: A Political History*. Karachi: Oxford, 2007.
16. Joyo, Mohammed Ibrahim. ”*Sindh Muhnje Khawabn Jee.* “. Center for Peace & Civil Society, Hyderabad, 2008.
17. Chandio, Jami, ”*Dynamics of Change & Future of Sindh*“, Center for Peace & Civil Society Hyderabad, 2007.
18. Chandio, Jami, ”*Crisis of Federalism and Prospects for Provincial Autonomy in Pakistan*“, 2009.

Articles

1. Adeney, Katharine. ”Constitutional Centring: Nation Formation and Consociational Federalism in India and Pakistan.“ *Commonwealth and Comparative Politics* 40, no. 3 (2002): 8-33.
2. Ahmad, Eqbal. ”Meanings in the Disaster“ *Dawn.* April 17, 1994.
3. Ahmed, Feroz. ”Ethnicity, Class and State in Pakistan.“ *Economic and Political Weekly*, 31, no. 47 (1996): 3050-3053.
4. Ahmed, Dr. Gulfaraz. ”Fiscal Federalism: Resource Sharing Issues.“ Pakistan Institute of Development Economics, February 21, 2007.
5. Ahmed, Iftikhar, Usman Mustafa and Mahmood Khalid. ”National Finance Commission Awards in Pakistan: A Historical Perspective.“ PIDE Working Papers 2007:33, Pakistan Institute of Development Economics, Islamabad, 2007.
6. Cohen, Stephen Philip. ”The Nation and the State of Pakistan“ The Washington Quarterly 25, no. 3 (2002): 109—122.
7. Haqqani, Husain. ”The Role of Islam in Pakistan's Future.“ The Washington Quarterly 28, no. 1 (2004): 85—96.

8. Hippler, Jochen. "Problems of Democracy and Nation-Building in Pakistan." Nation-Building in Pakistan. http://www.jochen-hippler.de/neu-aufsaetze/Nation-Building-Pakistan.htm
9. Kennedy, Charles H. "Policies of Ethnic Preference in Pakistan." *Asian Survey* 24, No. 6 (Jun., 1984): 688-703.
10. Khan, Adeel. "Pakistan's Sindhi Ethnic Nationalism: Migration, Marginalization, and the Threat of "Indianization"" *Asian Survey* 42, No. 2 (2002): 213-229.
11. Kundi, Dr. Mansoor Akbar. "Federalism/Demarcation of Roles for Units in Pakistan." (Unpublished article)
12. Memon, Dr. Aman. "Provincial Autonomy in Historical Perspective: Case Study of Sindh." (Unpublished Article)
13. Memon, Rafique-ul-Rehman. "Fiscal Decentralization and Inter-Governmental Transfer Systems: Issue of NFC in Pakistan." (Unpublished Working Paper)
14. Memon, Naseer. "Oil & Gas Resources and Rights of Provinces." (Unpublished Working Paper)
15. Naseer, Sajjad. "Federalism and Constitutional Development in Pakistan" Paper presented at an international seminar on "Constitutionalism and Diversity in Nepal" organized by Centre for Nepal and Asian Studies, Kathmandu, Nepal, August 22-24, 2007.
16. Nazir, Muntzra. "The Problems and Issues of Federalism in Pakistan." *Journal of Pakistan Vision*. 9, no. 1, (2007): 109-128.
17. Rahman, Tariq. "Language, Politics and Power in Pakistan: The Case of Sindh and Sindhi" *Ethnic Studies Report*. 17, no. 1 (1999): 21-34.
18. Rizvi, Hasan-Askari. "Democracy in Pakistan." Paper prepared for the Project on State of Democracy in South Asia as part of the Qualitative Assessment of Democracy, Lokniti (Programme of Comparative Democracy), Centre for the Study of Developing Societies, Delhi.

19. Stepan, Alfred. "Federalism and Democracy: Beyond the U.S. Model" *Journal of Democracy* 10, no. 4 (1999): 19-34.
20. Tellis, Ashley J. "U.S. Strategy: Assisting Pakistan's Transformation" *The Washington Quarterly* 28, no. 1. (2004): 97—116.
21. Waseem, Mohammad. "Affirmative Action Policies in Pakistan." *Ethnic Studies Report*, 15, no. 2 (1997): 223-245.
22. Waseem, Mohammad. "Pluralism and Democracy in Pakistan." *International Journal on Multicultural Societies (IJMS)* 5, no. 2 (2003): 172-176.
23. Wilkinson, Steven. "Democratic Consolidation and Failure: Lessons from Bangladesh and Pakistan." Democratization 7, no. 3 (2000): 203-226.

Reports

1. Davis, Ralph K. Report for 2003AR57B: Analysis of Water Conflicts in Pakistan and the Middle East - A Comparative Study. U.S. Geological Survey. 2003.
2. Harrison, Selig S. "Pakistan: The State of the Union." Special Report. Center for International Policy. April 2009.
3. International Crisis Group. "Pakistan's Tribal Areas: Appeasing The Militants." Asia Report N 125. December 11, 2006.
4. International Crisis Group. "Pakistan: The Forgotten Conflict in Balochistan." Update Briefing. Asia Briefing N 69. October 22, 2007.
5. International Crisis Group. "Pakistan: The Worsening Conflict in Balochistan" Asia Report N 119. September 14, 2006.
6. Laghari, Munawar. "Sindh Monitor: Plight of Sindhis in Pakistan." United Nations. Council on Human Rights, 10th Session, Geneva, March 2-27, 2009.
7. Markey, Daniel. "Securing Pakistan's Tribal Belt." Council on Foreign Relations— Center for Preventive Action. CSR No. 36, August 2008.

8. Mezzera, Marco and Safiya Aftab. ”Pakistan State-Society Analysis.‟ Report from the Democratisation and Transitional Justice Cluster. Initiative for Peacebuilding. January 2009.
9. Nawaz, Shuja. ”FATA: A Most Dangerous Place‟ Center for Strategic and International Studies Report. January 2009.
10. Proceedings from Workshop for NWFP MPAs on Federal, Provincial and Local Governments: Demarcation of Roles, Issues and Possible Solutions. PILDAT Legislative Capability Building Programme. Hotel Pearl Continental, Peshawar, August 27-28, 2003.
11. Schaffer, Teresa. "Pakistan's Future and U.S. Policy Options." A Report of the CSIS South Asia Program. Center for Strategic and International Studies. March 2004.
12. ”The Next Chapter: The United States and Pakistan‟ A Report of the Pakistan Policy Working Group. September 2008.
13. Ul Haq, Dr. Noor (ed.). ”The Indus Waters Treaty (Abridged) September 19, 1960.‟ In *Water Issue in Perspective*. Islamabad Policy Research Institute. http://ipripak.org/factfiles/ff45.shtml
14. Wadhams, Caroline, Brian Katulis, Lawrence Korb, and Colin Cookman. ”Partnership for Progress: Advancing a New Strategy for Prosperity and Stability in Pakistan and the Region‟ Center for America Progress Report. November 2008.